سرنوشت

۱۹۰۸

مجنوں گورکھپوری

نفیس اکیڈیمی

حیدرآباد (دکن)

قیمت دو روپیہ کلدار

طبع اوّل ——— ایک ہزار

دسمبر ۱۹۴۴ء

پروپرائٹر

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس

حیدرآباد (دکن)

انتساب

بہر کجا ناز سر بر آرد نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل من و نگاہے و صد تمنّا

مجنوںؔ

واردات

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

"سرنوشت" نیا عنوان رکھا گیا ہے۔ اس مسلسل افسانے کا جو "ایک نکمے کی سرگذشت" کے نام سے "ایوان" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ تب سے ایک پورا جنم گذر چکا ہے۔

قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں کچھ اور کہوں مجھے اس افسانہ کے بارے میں اپنے ایک نا دیدہ کرم فرما کی رائے کا ذکر کرنا ہے جس کو یاد کرکر کے ہنسی آتی ہے۔ مجھے اس وقت نہ اُن کا نام یاد رہا اور نہ اس اخبار کا جس میں اونھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ عرصہ ہوا کسی اخبار میں ایک صاحب نے بڑے زعم اور واقف کارانہ اعتماد کے ساتھ لکھا تھا کہ "ایک نکمے کی سرگذشت" روس کے مشہور افسانہ نگار ٹورگنیف (Turgenief) کے افسانہ The Diaryofasuperfluousman کا ترجمہ ہے۔ یا اس سے براہِ راست ماخوذ ہے۔ ایسی سطحی اور بے سوچی سمجھی رایوں کی ہمارے ملک میں کمی نہیں۔ میں نے اس وقت اس کا جواب اس لئے نہیں دیا تھا کہ جو شخص اپنی لاعلمی کو علم اور اپنی عدم اہلیت کو اہلیت بنا کر پیش کر رہا ہو اس سے تکرار کیا کی جائے۔ ہمارے دوست کی رائے

اس بات کی کھلی ہوئی دلیل تھی کہ اونھوں نے یا تو ٹورگنیف کا افسانہ نہیں پڑھا ہے یا میرا افسانہ یا دونوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے اور دونوں کے ناموں کی مشابہت دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ تو بہت بڑا انکشاف ہے جس کی اشاعت کے لئے وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

بہر حال اب جبکہ افسانہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے محرکات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

افسانہ کا پہلا محرک اپنا وہ ذاتی تجربہ ہے جو ۱۹۲۲ء سے کئی سال تک میری زندگی کو خراب و خستہ کئے رہا۔ میں خود کم و بیش تین سال تک وجع الفواد یعنی درد دل کے مرض میں مبتلا رہ چکا ہوں اور مجھ پر اس کے شدید دورے پڑ چکے ہیں۔ ہر دورہ ایک سکراتی عالم ہوتا تھا جس کے گذر جانے کے بعد بھی میں ہفتوں کے لئے پابند بستر ہو جاتا تھا۔ اور مستقبل کے متعلق دور تک سوچا کرتا تھا۔ مجھے اس وقت احساس تھا اور اب بھی کچھ احساس ہے کہ اس حالت میں میری قوت متخیلہ کی تیزی اور رسائی غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں شعر کہتا تھا اور نثر کے میدان میں نہیں آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جتنے اشعار دورہ کے ایام میں کہے جاتے تھے وہ تعداد اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے میرے اور اشعار سے فائق ہوتے تھے حالانکہ اُن میں ایک شعر بھی ایسا نہ ہوتا تھا جس میں میری حالت کی طرف کوئی دور کا بھی اشارہ ہو۔ سوا ایک شعر کے جس میں کوئی توانائی نہیں ہے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ دورہ کے زمانہ میں میرے دل و دماغ
کی جو حالت ہوتی ہے وہ ایک مکمل نفسیاتی سرگذشت ہے جو بیان
کرنے کے قابل ہے۔ لیکن اس وقت تک نثر کی طرف کوئی خاص
میلان نہیں تھا اور افسانہ نگاری تو میرے فرشتوں کے بھی وہم
و گمان میں نہیں تھی۔ اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سال تک میں اس
جانگسل تجربہ سے محفوظ رہا اور میرے افسانہ نگاری کے دور میں اس
کی یاد بھی کچھ محو سی رہی۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جبکہ میں نے اپنی
طرف سے کسی قدر مطمئن ہو کر تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا اور
بی۔ اے میں پڑھتا تھا میری نظر سے انگریزی کی مشہور فسانہ نگار
خاتون جارج ایلیٹ کا ایک طویل مختصر افسانہ گذرا جس نے مجھے
بے حد متاثر کیا۔ اس افسانہ کا ہیرو بھی میری ہی طرح وجع الفواد
کا دائمی مریض تھا۔ اور وہ دورہ کی حالت میں مستقبل کا ایک
خاکہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بے اختیار جی چاہا کہ اپنی
سرگذشت کو میں دوسروں کی حدیث کے پردے میں بیان کردوں
اور اب یہ آسان تھا اس لئے کہ میں افسانے لکھنے لگا تھا اور
افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور یا بدنام ہو چکا تھا۔ لیکن اس
وقت میرے ذہن میں دنیا کے اور بہت سے بڑے بڑے
افسانے تھے جن کے نمونہ پر میں اردو میں افسانے لکھنا چاہتا تھا۔
کچھ لکھ چکا تھا کچھ لکھ رہا تھا۔ غرضکہ پھر یہ خیال دب کر رہ گیا۔

۱۹۳۲ء میری زندگی میں ایک سرحدی نشان (land mark) کا حکم رکھتا ہے۔ یہ میرے التباسات کا آخری سال ہے۔ اس کے بعد میرے بہت سے دھوکے جن کو میں جان کی طرح عزیز رکھتا تھا دور ہو گئے اور پھر اُن کی جگہ نئے دھوکے پیدا نہ ہو سکے۔ اس سے پہلے میرے لئے افراد کا انفرادی وجود بڑی اہمیت رکھتا تھا اور میں اس کی اصل و غایت اور اس کے مقدر پر بڑی محویت کے ساتھ سوچا کرتا تھا۔ لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا کہ افراد کا وجود ہئیت اجتماعی سے علیحدہ ہو کر کوئی معنی نہیں رکھتا اور انسانیت کائنات کے لامتناہی سلسلہ سے الگ ہو کر اپنی ساری اصلیت اور قدر کھو دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ تقدیر کا تصور بھی جو پہلے مبہم اور کچھ ماورائی تھا اب واضح ہو گیا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تقدیر کوئی غیر محسوس غیبی قوت نہیں ہے بلکہ مختلف مادی اور محسوس اسباب و عوارض کی ایک ترکیب ہے جن میں سے زیادہ تر سماج اور انسانی ماحول سے متعلق ہیں۔

ہاں تو اسی ۱۹۳۲ء میں میرے پُرانے مرض کے ہلکے سے آثار یکایک پھر نمودار ہو گئے اور میں چونک کر اندیشہ ناک ہو گیا۔ اس زمانہ میں "ایوان" نکالتا تھا جس کے بیشتر صفحے مجھی کو لکھنا پڑتے تھے۔ اب مجھے کچھ دھن سی ہو گئی کہ ایک افسانہ ایسا لکھنا چاہئے جس میں کچھ میرے درد دل کی بھی کسک ہو۔ اسی اثنا میں

ٹورگنیف کا افسانہ The Diary of a superflous man پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میرے ذہن نے فیصلہ کر لیا کہ افسانہ کی ھیئت اور اس کا عنوان کیا ہونا چاہیئے۔

میں ٹورگنیف کا اس سے زیادہ ممنون نہیں ہوں کہ افسانہ کا نام "ایک نکمے کی سرگذست" رکھا اور اس کو روزنامچے کی صورت میں لکھا اور بعض موقعوں پر موسم اور فضا کو بیان کرتے ہوئے ٹورگنیف کے افسانے کے کچھ نقوش میرے افسانے میں بھی آ گئے۔ اس سے بہت زیادہ میں جارج ایلیٹ کا ممنون ہوں۔ لیکن پھر بھی میرا افسانہ ایلیٹ کے افسانہ کا نہ ترجمہ ہے نہ ماخوذ۔ ایلیٹ کا افسانہ اس وقت میرے سامنے بھی نہیں تھا۔ اس کی ایک نہایت زندہ یاد میرے دل میں محفوظ تھی۔ میں نے اسی کے متوازی اپنے افسانہ کے واقعات مرتب کئے اور کوشش کی کہ مجموعی طور پر وہی فضا میرے افسانہ میں بھی پیدا ہو جائے جو ایلیٹ کے افسانہ کی روح ہے۔ لیکن افسانہ کی ترکیب میں سب سے زیادہ قوی اور محرک عنصر خود اپنے دل کے وہ تشنجات ہیں جنھوں نے کبھی میری زندگی موت سے بدتر بنا رکھی تھی اور جن کی ہلکی سی جھلک میں نے ۱۹۳۲ء میں پھر دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد سے برابر سال میں ایک دو مرتبہ اس حالت کے آثار مجھے نظر آ جاتے ہیں اور میں سہم جاتا ہوں۔ جنوری یا فروری ۱۹۴۴ء میں آخری دورہ ہوا تھا جس کے بعد سے ابھی تک امن سا ہے۔

یہ ہے میرے افسانہ کی تقریب اب اس کے بعد جس کا جو جی چاہے سمجھے۔

آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا مناسب ہو گا کہ کتابی صورت میں پیش کرنے کے لئے افسانہ پر پوری نظرِ ثانی ہوئی ہے اور بہت کچھ حذف و ترمیم سے کام لیا گیا ہے جس کی میرے خیال میں ضرورت تھی۔

مجنوںؔ گورکھپوری

امام باڑہ۔ گورکھپور
۲۸ نومبر ۱۹۲۴ء

سرنوشت

موضع لکشمی پور

تاریخ یکم دسمبر ۱۹ء

میری زندگی کا آخری لمحہ قریب ہے۔ میں اپنے دل کو دھوکہ نہیں دیتا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جبکہ میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں اور میں دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے بے خبر ہو جاؤں میں عرصہ سے دل کے عارضہ میں مبتلا ہوں ہر دوسرے تیسرے مہینے

مجھ پر اس جاں گسل بیاری کا دورہ پڑ جاتا ہے اور میری رگ رگ کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ پھر میں پندرہ بیس دن تک دورہ کے بعد بھی اس قابل نہیں رہتا کہ بستر سے جنبش کر سکوں۔ میرے جسم کی ساخت نازک نہیں اندیشہ ناک حد تک ضعیف ہے۔ مجھکو اس کی کبھی بھی پروا نہیں رہی۔ میں بچپن سے اپنی باطنی کیفیات میں کچھ ایسا کھویا رہا کہ جسمانی کمزوریوں کی طرف کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں کی۔ ساتھ ہی ساتھ دماغ کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے کم از کم طبیبوں کی یہی رائے ہے کہ میرے نظامِ عصبی میں فتور ہے جس نے بتدریج "وجع القلب" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ میرا مرض ابتدائً عصبی تھا۔ مگر اَب دل میں کوئی عضوی خرابی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

مجھے کھلے الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ میری زندگی کا کوئی اِعتبار نہیں اور مجھکو ہر وقت مرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو صرف اس اندیشہ میں اَب تک نہ جانے کتنی بار مر چکا ہوتا۔ مگر مجھ پر اطباء کی اِس "راست بازی" کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جینے میں کوئی لذت نہیں تو پھر مَرنے سے گھبراہٹ کیسی؟ سچ پوچھو تو میں موت کا انتظار کر رہا ہوں اور اس کا ٹھنڈے دل سے اِستقبال کرنے کے لیے تیار رہوں۔ اِس لیے کہ میری زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں واقعی نہ جانے کتنی بار مَر چکا ہوں۔ جب مجھ پر دورہ پڑتا ہے اور درد کی ٹیس دل سے

اُٹھکر سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ تو نہ جانے کتنی بار نزع کا عالم مجھ پر سے گزر جاتا ہے۔

غالبؔ نے شاعری کی ہے۔ لیکن کوئی مجھ سے پُوچھے۔ اگر ایک بار مر کر ہمیشہ کے لیے راحت نصیب ہو جائے تو میں اس کو اپنے لیے بہترین نعمت سمجھوں۔

میں اپنی زندگی کے اِس باب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ابھی مجھکو بہت کچھ کہنا ہے جو اس سے کہیں زیادہ ضروری اور غالباً دلچسپ ہو میرے اندر ایک ناقابل بیان قوت ہے جو مستقبل کو حال بنا کر میری آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے میں عموماً آنے والے واقعات کو پہلے ہی دیکھ لیتا ہوں۔ یہ قوت بچپن سے میرے اندر ہے۔ جس وقت یہ قوت متحرک ہو کر اپنا کام کرنے لگتی ہے۔ اس وقت میری عجیب حالت ہوتی ہے۔ رگیں کھنچنے لگتی ہیں۔ ریشہ ریشہ میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ گرد و پیش کی دنیا دھندلی ہوتے ہوتے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے اور میں ایک نئی دنیا میں ہوتا ہوں۔ جب سے مجھکو " وجع القلب" کے دورے ہونے لگے ہیں میری " مستقبل بیں" نگاہ غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی ہے۔ اطباء جو چاہیں کہیں مگر میرا اعتقاد یہ ہے کہ میرے مرض کا سبب اِسی " مقدر شناس" قوت کا غلبہ ہے سنتا آیا ہوں کہ انبیاء اور اَولیاء پر

وحی یا القا کے وقت ایک کیفیت طاری ہوتی ہے جس میں ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ دنیا اس کو وجدانی کیفیت کہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی وہ کیفیت میرے وجع القلب سے بہت کچھ ملتی جلتی ہوگی۔ میں اپنے علم غیب سے عاجز ہوگیا ہوں۔ مجھے اس کا رونا ہے کہ مجھے یہ دور رس نگاہ کیوں دی گئی۔ نوشتہ تقدیر کو بدل نہیں سکتا تو پھر اس کو جان کر کیا کروں گا۔ اس سے کہیں زیادہ انسان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ جو کچھ آفاتِ ارضی و سماوی اس پر نازل ہوں وہ اچانک نازل ہوں اور اس کو پہلے سے گھلنے کا موقع نہ دیں۔ لیکن کارپردازانِ قدرت کو ایک مذاق سوجھا۔ مجھے آگے پیچھے کا علم دیا گیا اور جیتے جی مرتے رہنا میرا مقدر ٹھیرا۔ ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ میں بہت جلد مرنے والا ہوں۔ اب سے ٹھیک چار مہینے بعد اپریل کی یکم تاریخ کو۔ اُف! وہ دن وہ گھڑی کس تفصیل کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بہار کا موسم ہوگا۔ دنیا از سرِ نو ہری بھری ہو رہی ہوگی۔ سامنے باغ میں فضا پر کیف ہو رہی ہوگی۔ گردو پیش کے جنگل

نئی زندگی سے معمور ہو رہے ہوں گے۔ شام کا وقت ہو گا۔ سورج شفق کی سرخ چادر میں روپوش ہو چکا ہو گا۔ میں قسمت زدہ اُن مناظر کی لذّتوں سے بیگانہ جنگل کی فرحت بخش اور جانفزا ہوا سے محروم اپنے دارالمطالعہ میں گرم کوٹ اور اونی موزے پہنے ہوئے بیٹھا کوئی کتاب دیکھتا ہوں گا۔ دفعتاً میرا جی سن سے ہو جائے گا میں گھبرا جاؤں گا۔ پھر مجھ پر ایک قسم کی غشی طاری ہونے لگے گی۔ میں کسی خدمتگار یا کسی اور شخص کو آواز دینا چاہوں گا مگر نہ دے سکوں گا۔ پھر وہ ہوکیں اُٹھیں گی اور چلانے لگوں گا۔ لیکن یہ ہوکیں اور ہوکوں کی طرح نہ ہوں گی۔ بلکہ ہلکی اور دیرپا ہوں گی۔ موت سر پر ناچ رہی ہو گی۔ میں اس کو دیکھتا ہوں گا اور پھر اسی زندگی کی آرزو کرتا ہوں گا جو میرے جی کا جنجال بنی ہوئی ہے۔ میرا دم دھیرے دھیرے گھٹنے لگے گا اور پھر اس کے بعد کیا ہو گا۔ تاریکی۔ ایک اندھیری خلا۔ نہ وہ ہوک نہ وہ تڑپ نہ وہ میں نہ وہ میری دنیا۔ ان سب کے بجائے ایک لامتناہی تاریکی جس میں سوا حرکت کے کچھ نہ ہو گا۔ خیر یہ سب تو یکم اپریل کو ہو گا۔ ابھی اس کو چار مہینے ہیں اِس درمیان میں میں اپنے دل دماغ کی پوری قوت صرف کر کے اور اپنے سارے زورِ قلم سے کام لے کر اپنی زندگی کے تجربات کو ابتدا سے انتہا تک لکھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے پڑھنے والا اس سے کچھ فائدہ

حاصل کر سکے اور لکھنے والے کے حق میں دعائے خیر کرے میں نے آج تک کسی کو اپنی داستان نہیں سنائی ہے۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میں دنیا میں یکہ و تنہا ہوں۔ چند دُور کے رشتہ دار ہیں جن کو مجھ سے نفرت ہے۔ وہ مجھکو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اُنھیں پر کیا موقوف ہے۔ دنیا میں شاید کوئی ایسا ہو جو مجھ جیسے نکمّے کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے۔ میں مبالغہ کو راہ نہیں دیتا۔ میں واقعی ایک مجہول ہستی ہوں نہ اپنی ذات کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ کسی دوسرے کو، ایسا نامراد دنیا والوں سے کیا توقع رکھ سکتا۔ پھر یہ خامہ فرسائی کیوں کر رہا ہوں اپنی زندگی کا المنامہ بیان کرکے کیا کروں گا جبکہ کسی کو اُس سے دلچسپی نہیں ہوسکتی؟ میں اپنا درد اَب تک چھپائے رہا اس لیے کہ جانتا تھا کوئی ہمدردی کرنے والا نہیں۔ مگر اَب میرے مَرنے کے دن قریب ہیں اور مرنے کے بعد ہر شخص کم از کم تھوڑے عرصہ کے لیے ہمدردی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ دنیا صرف ان لوگوں کی غلطیوں کو معاف نہیں کرتی جو ابھی جی رہے ہیں۔ جب تک دل حرکت کر رہا ہے اس کو جتنا جی چاہے ستا لو۔ جب تک آنکھیں آنسو کی نمی لیے ہوئے تم سے اِلتجا کر رہی ہیں۔ جس قدر ہو سکے ان کو اپنی سرد مہری اور بیرخی سے اور بھی غمگین کرتے جاؤ جب تک کان تمھارے نرم تسلّی بخش الفاظ سُننے کی قوت رکھتے ہیں۔

جہاں تک ممکن ہو ان کو دِل خراش اور روح فرسا باتیں سُنا لو جب تک بُرے بھلے کی تمیز دماغ میں موجود ہے۔ جب تک وہ تمھاری بیدردیوں کو محسوس کر سکتا ہے اس وقت تک اپنی غلط رائے سے۔ اپنی جارحانہ تنقیدوں سے اپنے غیر ذمہ دارانہ اعتراضات سے اس کو خوب دُکھ پہنچا لو دل رفتہ رفتہ ایک دن ساکت ہو جائے گا۔ آنکھیں اِلتجا کرنا چھوڑ دینگی کان بہرے ہو جائیں گے۔ دماغ اپنے تمام شکوے بھول جائے گا اور تب تمھاری ہمدردیاں شروع ہوں گی۔ اس وقت مرنیوالے کی برائیوں میں بھی بھلائی کے پہلو نکلنے لگیں گے۔ تم کو اس کی ناکامیوں پر ترس آنے لگے گا اور پھر تم اس کی ناکامیوں اور نارسا تدبیروں کا اِحترام کرنے لگو گے۔ اسی امید کی بنا پر میں بھی اپنی زندگی کے واقعات لکھ رہا ہوں ممکن ہے دو چار خدا کے بندے ایسے نکل آئیں جو خلوص دِل کے ساتھ کہہ اُٹھیں۔

"کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

میں اب اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرتا ہوں اور اس کا مقابلہ بعد کے زمانہ سے کرتا ہوں تو وہ مجھکو پر کیف معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ دراصل ایسا نہ تھا۔ میں جنم کا سوداوی المزاج ہوں لیکن پھر بھی میں اور ہمسنوں کی طرح بچپن میں افکار و آلام سے قطعاً آزاد تھا۔ حال کے سوا گزشتہ

اور آئندہ میرے لیے کوئی اصلیت نہیں رکھتے تھے۔ جو بات ہو گئی اس کا کوئی غم نہ تھا اور جو بات ہونے والی ہوتی اس کی کوئی فکر نہ تھی میں موجود ہ لمحہ کو اپنی ساری زندگی سمجھتا تھا اور اس کی جس قدر لذتیں تھیں سب کو محسوس کرتا تھا۔

خدا کے فضل سے مجھکو ماں بھی ایسی ملی تھی جو میری دیکھ بھال میں ستی ہو جانے کے لیے ہر دم تیار رہتی۔ میں اس کا اکلوتا بچہ تھا۔ مجھکو اگر کبھی معمولی سے معمولی ٹھیس لگ جاتی تو اس کا دل دکھ جاتا تھا۔ مجھے وہ دن ابھی کل کی طرح یاد ہے جبکہ میری دونوں آنکھوں میں ایک قسم کا مرض پیدا ہو گیا تھا اور میں بالکل اندھا ہو گیا تھا۔ میری ماں کی حالت اس وقت جو دیکھتا تھا وہ رو دیتا تھا۔ صبح سے آدھی رات تک بیچاری مجھکو اپنی گود سے جدا نہیں کرتی تھی اگرچہ اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی میرے باپ مجھ سے بے انتہا مایوس رہا کرتے تھے۔ میری اٹھان ان کی امیدوں کے مطابق نہ تھی۔

میرا خیال یہ ہے کہ میرے باپ ان لوگوں میں سے تھے جو گھریلو زندگی کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔ ہندوستان میں خوامخواہ اس کلیہ کو بمنزلہ بدیہیات مان لیا گیا ہے کہ ہر شخص "گرہست آشرم" کے لیے پیدا ہوا ہے حالانکہ ایسی ہستیاں بے شمار نکلیں گی جو ابتدا ہی سے

"بن باس" اور "سنیاس آشرم" سے طبعی مناسبت رکھتی ہیں۔ جن لوگوں نے میرے باپ کے گلے میں تاہل کا طوق پہنایا وہ ہرگز معاف کیے جانے کے مستحق نہیں۔

میرے باپ کو بیوی بچوں سے کوئی اُنس نہ تھا لیکن چونکہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مذاق سلیم رکھنے والے آدمی تھے اس لیے ان کو اپنے فرائض کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ ہم لوگوں کے جسمانی آرام و آسائش اور ظاہری فلاح و بہبود کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا۔ زندگی میں ہم سے بے شعوری کی حالت میں غلطیاں ہو جاتی ہیں یا غلطیاں کرائی جاتی ہیں اور یہ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کو بنا بگاڑ سکتی ہیں اور ہماری بے بسی دیکھیئے گا کہ ہم غلطی کو غلطی اس وقت سمجھتے ہیں جب اصلاح ناممکن ہوتی ہے۔ میرے باپ سے بھی ایسی ہی غلطی ہوئی۔ فطرتاً وہ شاعر تھے۔ وجدانیت کا عنصر ان کے اندر تمام عناصر پر غالب تھا۔ ممکن ہے میں مبالغہ کر رہا ہوں لیکن میرا یقین ہے کہ وہ شاعر ہو سکتے تھے، ولی ہو سکتے تھے، صاحب کشف و کرامات ہو سکتے تھے، پیغمبر ہو سکتے تھے۔ مگر وہ چیز کبھی نہیں ہو سکتے تھے جو وہ آخر کار ہو کر رہ گئے شامت سوار تھی۔ شوق ہوا سائنس اور ریاضیات پڑھنے کا۔ ذہن رسا تھا ہی۔ ان علوم میں پوری دست گاہ حاصل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک "طرفہ معجون" ہو کر رہ گئے۔ ایک طرف تو

فطری جوہر وجدانیت اور دوسری طرف سائنس کی کثیف مادیت۔ اس کشمکش نے میرے باپ کو خاصا "دھوبی کا کتا" بنا کر رکھ دیا اور وہ کہیں کے نہ رہے۔ عمر بھر تجارت میں گنوائی اور حاصل کچھ نہیں دونوں ہاتھ اسی طرح خالی کے خالی۔ تجارت میں علم و عمل ایک ہی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ میرے باپ میں علم کا تو وہ زور کہ روز حشر تک کی باتیں پہلے سے سوچ ڈالتے تھے لیکن آخر وہ شعریت کہاں جاتی۔ وہ تو خواب و خیال کی دنیا کے لیے بنائے گئے تھے جہاں عمل کا گزر نہیں۔ عمل کا وقت آتا تو ان کی سوچی سمجھی تجویزیں سب ناکام رہ جاتیں مختصر یہ کہ ان کی تجارت شاعرانہ تجارت تھی جس نے ان کو کافی مالی نقصان پہنچایا۔

۱۵ مارچ جنوری

ابھی ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ تیس میل سے پچاس روپئے کے لالچ میں یہاں تک منھ پھیلائے آئے تھے اپنے فن کے خاصے ماہر ہیں۔ آدمی بھی بُرے نہیں ہیں۔ لیکن وہی مرض جو اِس کلجگ میں سب کو ہوتا ہے اُن کو بھی لاحق ہے۔

روپئے کی ہوس میں اندھے رہتے ہیں اور جان کو جان نہیں سمجھتے۔ مجھے ایسے کور دہ میں اگر کوئی بلاتا تو میں تو ہرگز نہ جاتا چاہے اس کے

صلہ میں مجھے بہشت ہی کیوں نہ مل جاتی۔ مگر میں یہ شاید اس لیے دعوے کر رہا ہوں کہ میرے پاس دولت ہے اور میرے امتحان کی نوبت نہیں آسکتی۔

ہاں تو ابھی یہ ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئے تھے۔ آج وہ اور بھی میری زندگی سے مایوس گئے ہیں۔ ان کی صورت کچھ ماتم زدہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو انھوں نے بہت رکتے رکتے کہا آپ کا مرض لمحہ بہ لمحہ مہلک ہوتا جاتا ہے اور آپ کی حالت بہت نازک ہو رہی ہے شاید آپ معقول پرہیز اور احتیاط سے کام نہیں لیتے۔" مطلب یہ تھا کہ آپ بہت جلد مرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر کو کیا معلوم کہ ان سے زیادہ یہ میں جانتا ہوں۔ خدا بھلا کرے میری "غیب بین" نگاہ کا جو سب کچھ وقت سے بہت پہلے دیکھ لیتی ہے۔ مجھے بہت جلد مرنا ہے۔ اور اسی لیے میں یہ روزنامچہ تیار کر رہا ہوں یہ بھی کیا مسخرہ پن ہے کہ جب مرنے کو مشکل سے ڈھائی مہینے رہ گئے ہیں تب مجھے اپنی سرگزشت لکھنے کا شوق ہوا۔

ہاں تو مجھے مرنا ہے اور بہت جلد مرنا ہے .... یعنی موسم بہار میں جب کہ ساری دنیا پھر سے جوان ہو رہی ہوگی۔ میں یہاں سے چل بسوں گا اور کہاں جاؤں گا؟ ......

خدا جانے کہاں جاؤں گا۔ جب اس دنیا کو چھوڑنا ہی ہے تو یہ بحث بیکار ہے کہ اس کے بعد کہاں جانا ہوگا۔ شاید جہنم میں، مجھے سب سے

بڑا اطمینان یہ ہے کہ میں بہار کے ایام میں مروں گا۔ خزاں میں نہیں جبکہ کائنات کی ہر چیز مرتی ہے۔ لیکن آخر یہ عین موت کے منہ میں پہنچ کر روزنامچہ کی مجھے خوب سوجھی۔

میری زندگی کے صرف ڈھائی مہینے رہ گئے ہیں۔ مگر جب موت ایسی سنگین اور جابر حقیقت ہے تو پھر ڈھائی دن۔ ڈھائی مہینے۔ ڈھائی سال۔ ڈھائی صدیاں سب برابر ہیں۔

مرنے کے بعد خضر کی عمر اور پتنگے کی عمر دونوں یکساں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ خلود وابدیت کے سوا جو کچھ ہے ہیچ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر مرنا ہے تو ابدیت بھی ہیچ ہے مگر میں تو ما بعد الطبیعیات کے مسائل بیان کرنے لگا۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے شاید میرا دل ڈوب رہا ہے اسی لیے ایسی نیاری باتیں مجھے سوجھ رہی ہیں۔ لیکن پھر میں آج کا روزنامچہ شروع کیسے کروں ؟ کمرے سے باہر قیامت کی سردی پڑ رہی ہے۔ محاورہ بھی عجب چیز ہے۔ ذرا اس "قیامت کی سردی" پر غور کیجئے گا۔ قیامت کے دن تو سنتے ہیں کہ آفتاب سوا نیزے پر ہوگا۔ پھر قیامت کی سردی کے کیا معنی ؟ مگر یہ تو محاورہ ہے۔

مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی سخت ممانعت ہے۔ پھر میں لکھوں کس چیز کے متعلق ؟ موسم اور رُت کا صحیح علم مجھکو نہیں اپنی بیماری کے تفصیلی حالات

لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بیماری اور موت ایسی چیزیں نہیں جن کا کوئی مہذب آدمی نام لے۔

افسانہ لکھنا مجھے آتا نہیں۔ گردوپیش کی زندگی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ فلسفہ کے نکات میری سمجھ میں نہیں آتے پھر میں کیا کروں۔ بیکار بیٹھے بیٹھے دم گھٹتا ہے۔ کوئی کتاب پڑھنے کو جی نہیں چاہتا اس لیے روزنامچہ لکھنے بیٹھ گیا۔

میری عمر تیس سال کی ہے۔ میرے ماں باپ کے متعلق کچھ نہ کچھ آپ لوگ جان گئے ہیں۔ میں اچھا خاصا تعلقدار ہوں۔ اور اطراف وجوانب میں میرا رعب چھایا ہوا ہے باپ کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ ان میں مجھے دنیا کی ہر خرابی نظر آتی تھی۔ وہ مجموعہ نقائص تھے۔ میری ماں میں البتہ دنیا کی ہر خوبی موجود تھی۔ بس تقدیر کھوٹی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مرتے دم تک ایک لمحہ کے لیے اس کو سکھ نصیب نہیں ہوا۔ جو خوبیاں دوسروں کی زندگی کو خوشگوار بناتی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہی خوبیاں اس کو نمارت کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں چوبیس گھنٹے میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو سکون نہیں ملتا تھا۔ صبح سے شام تک اس کی زندگی رنج اور آزمائش کی زندگی تھی۔ اس کے چہرہ پر صرف ایک بار سکون و اطمینان مجھے نظر آیا اور وہ اس وقت جبکہ لوگ اس کی میّت کو غسل دے کر دفن

کرنے لیجا رہے تھے اسکو کوئی بڑی مدت نہیں گزری ہے۔

اس کا منھ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے ہوئے کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اور اس کے بشرہ سے ایک سکون آمیز حیرت ٹپک رہی تھی گویا وہ زبان حال سے کہہ رہی تھی "سکون بھی کیسے مزے کی چیز ہے" بیشک زندگی کے تھکا دینے والے احساس سے آزاد ہو جانا۔ زندگی کی بیچینیوں سے نجات پا جانا کیسے مزے کی بات ہوگی۔ مگر یہ کیا۔ میں تو پھر بہک چلا۔

میں اپنی ماں کا بڑا لاڈلا تھا۔ لیکن خدا نہ کرے کوئی باپ کے پیار سے محروم ہو۔ پھر اس کی تعلیم و تربیت کا خدا ہی مالک ہے۔

میری ماں نے بہت چاہا کہ اپنے دم سے باپ کی شفقت کی کمی پوری کرے۔ مگر یہ نہ کبھی ہوا ہے۔ نہ کبھی ہوگا۔

میری تربیت ناقص رہ گئی۔ میرے باپ کو اپنی کمزوریوں کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ ان کو دور نہ کر سکتے تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ وہ میری ماں کے مقابلہ میں ایک نہایت فرو تر ہستی ہیں۔

یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ مجھے ماں سے اتنا انس نہ تھا جتنا کہ باپ سے تھا۔ میں باپ پر جان دیتا تھا اور ماں سے جی چراتا تھا اس سے میرے مزاج و طبیعت کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں باپ کی زندگی کو اپنی زندگی کا معیار بنائے ہوئے تھا۔ اور ماں سے زیادہ باپ ہی کو چاہتا رہا۔ اگرچہ میں

دیکھ رہا تھا کہ باپ کو میرے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

رات زیادہ گزر گئی ہے۔ اب میں کل پر اٹھا رکھتا ہوں۔ دیکھئے کل میری بیماری کا کیا رنگ رہتا ہے۔ آج تو کوئی دورہ نہیں پڑا۔

---

۱۸ جنوری

آج روز سے زیادہ سردی پڑ رہی ہے۔ آسماں بھی ابر آلود ہے۔ میرے لیے ایسا دھندلا اور حسرت ناک موسم زیادہ مناسب ہے میں ایسے موسم میں اپنی سرگزشت زیادہ سکون یعنے سرد مہری کے ساتھ سنا سکتا ہوں ورنہ اگر موسم خوشگوار ہو تو اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات کو یاد کرکے دل میں ہوکیں اٹھنے لگتی ہیں اور اکثر اسی بہانہ مجھ پر دورہ پڑ جاتا ہے۔ میں اب جذبات و تاثرات کا ہیجان برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا اب میرے کلیجے میں اتنا خون باقی نہیں کہ کسی قسم کے ہیجان یا شورش کو برداشت کرسکوں۔ مگر خیر۔ یہ افسردگی اور سردی کا موسم میری حالت کے موافق ہے اور میں سکون و سنجیدگی کے ساتھ اپنی داستان زندگی سنا سکتا ہوں۔

ہاں تو میری عمر کوئی ۱۲ سال کی تھی کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا میری ماں کو ایسا غم ہوا کہ وہ کئی دن تک چارپائی سے ہل نہیں

سکتی تھی، لیکن آخر کار اس کو میرے لیے اپنے کو زبردستی سنبھالنا پڑا۔ اس کی ساری عمر جلاپے میں کٹی۔ جو دن اس کے عیش منانے کے تھے ان میں وہ سوگوار رہی۔ اب اس کی امیدیں مجھ سے تھیں میں ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ سوا میرے اس کو زندگی سے کوئی پھل نہیں ملا۔ آہ! میری ماں کو کیا کیا ارمان تھے اور مجھ سے کیسی کیسی امیدیں تھیں۔ اور میرا یہ حشر ہونے والا ہے شکر ہے کہ اس دل جلی کو میرے یہ دن دیکھنا نہیں پڑے۔

اب میری عمر اس قابل تھی کہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی انگریزی اسکول میں بھیجا جاتا مجھے اردو فارسی میں گھر پر کافی تعلیم دلائی جا چکی تھی اور میں اپنے اکتسابات علم و ادب میں دس بیس سے بہتر تھا۔ لیکن اب تک میں کسی مدرسہ میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ گھر پر کچھ انگریزی پڑھ رہا تھا۔ اب میری ماں کو فکر ہوئی کہ میرا نام کسی اچھے اسکول میں لکھایا جائے۔ ہم لوگ زیادہ تر لکشمی پور ہی میں رہتے تھے۔ باپ کا کوئی معمول نہیں تھا۔ وہ اکثر شہروں میں مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ اور گھر پر پہینہ میں مشکل سے پندرہ دن رہتے تھے۔

خیر۔ تو اب میرے لیے دیہات میں رہنا مناسب نہیں تھا مجھے قریب کے کسی شہر میں جا کر اسکول میں داخلہ کرانا تھا۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اور میں ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ مجھکو پل بھر کے لیے

اپنی نظر سے اوجھل نہیں رکھ سکتی تھی مجبوراً اس نے یہ فیصلہ کیا کہ خود میرے ساتھ چل کر شہر "ب" میں رہے گی جو لکشمی پور سے کوئی ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور جہاں اپنا ایک عالیشان مکان اور ایک چھوٹی کوٹھی ہے۔ سوا اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ قصّہ مختصر۔

میری ماں بہت جلد مجھے لے کر "ب" چلی آئی۔ اور میرا نام گورنمنٹ اسکول میں پانچویں جماعت میں لکھا دیا۔ اب میری بالکل ایک نئے قسم کی زندگی تھی ...... مگر ابھی مجھے ایک بات یاد آگئی۔ کیا واقعی میری زندگی اس قابل رہی ہے کہ اس کو لوگوں سے بیان کیا جائے مجھ کو اس میں شبہ ہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ میری زندگی اِس قابل نہیں ہے۔ وہی زندگی کی آزمائشیں۔ وہی انسان کی کوششیں۔ وہی مجبوریاں اور ناکامیاں جو سب کی زندگی میں ہوتی ہیں میری زندگی میں بھی رہی ہیں پھر دوسروں کو میرے ساتھ کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور وہ میری بے سروپا داستان کیوں سننے لگے؟ مگر اَب تو میں اپنا قصّہ سنا رہا ہوں۔ آپ سنیئے۔ اور کچھ نہ سہی صرف اسی خیال سے کہ مرنے سے پہلے میری یہ خواہش ہے کہ آپ ایک نکمّے کی سرگزشت سن لیں۔

لیکن اَب تو میں تھک گیا ہوں اور آج اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا باقی پھر کل۔ یارزندہ صحبت باقی۔ پھر بھی آج اس قدر اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ

شہر "ب" میں پہنچنے سے پہلے میری مستقبل بیں "نگاہ" نے ایک جھلک میں مجھے دکھا دیا تھا کہ میری آئندہ زندگی کیا ہونے والی ہے۔ میں نے اس وقت اس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں نے بچپن میں اپنی اس غیب دانی کو ہمیشہ ایک وہم سمجھا۔ اس کی قدر و قیمت بہت دیر میں میرے ذہن نشین ہوئی۔ چونکہ میں اپنی ساری داستان پھر سے دہرا رہا ہوں اس لیے یہاں یہ دُہرانا بیکار ہے کہ میں نے اس "غیبی" جھلک میں کیا دیکھا تھا۔ اچھا تو آج رخصت!

۱۹ر جنوری

آج میری طبیعت کل سے بھی زیادہ موزوں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادھر کئی روز سے میری حالت سنبھلی رہی ہے لیکن ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ آج کا موسم کل سے بھی زیادہ دھندلا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ اب ایسے موسم میں مجھکو زیادہ سکون نصیب ہوتا ہے اور میں ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر تبصرہ کر سکتا ہوں کسی زمانہ میں میں نے اپنے حسب حال ایک شعر کہا تھا۔ اس سے آپ لوگ میری طبیعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ؎

تھی طبیعت ہی کچھ اپنی مائل افسردگی
ہم تماشا کر فصل گل رنگ خزاں دیکھا کیے

میری طبیعت کو فطرتاً خزاں کی پژمردگی سے زیادہ مناسبت ہے۔ آج مجھے ایک نیا لفظ سوجھا ہے۔ ناکارہ۔ ناکارہ۔ اس سے بہتر میں اپنی تعریف نہیں کرسکتا۔ جتنا ہی زیادہ میں اپنی طبیعت اور اپنی زندگی پر غور کرتا ہوں، اتنا ہی زیادہ مجھے قائل ہونا پڑتا ہے کہ میں ناکارہ ہوں۔ مجھ میں اور دوسروں میں یہی فرق ہے۔

دوسرے ناکارہ نہیں ہوسکتے۔ اور لوگ یا تو اچھے ہوتے ہیں یا برے ہوتے ہیں۔ ہوشیار ہوتے ہیں یا احمق ہوتے ہیں۔ قابل تحسین ہوتے ہیں یا قابل ملامت۔ مگر میں یہ سب کچھ نہیں ہوں۔ میں محض ناکارہ ہوں۔ میری زندگی میں کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر مجھے کوئی ملامت ہی کرے۔ میری زندگی یکسر بے رنگ و بے کیف ہے۔ کاش اس پر بدکرداری ہی کا رنگ چڑھا ہوتا۔ کاش مجھ پر سیاہ کاری ہی کا الزام لگایا جاسکتا! جب ایک ناکردہ گنہگار کی یہ زندگی ہے تو کاش اس سے پہلے کچھ گناہ ہی کرلیتا تاکہ زندگی کی لذتوں سے بیگانہ تو نہ رہتا۔ لیکن میں اپنی داستان کو بیکار طوالت دے رہا ہوں۔ مجھے اصل واقعات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ہاں تو اب میں اپنی ماں کے ساتھ شہر "ب" میں رہنے لگا جہاں اپنے دو ذاتی مکانات تھے جو اب سے پہلے کرایہ پر دئے جاتے تھے لیکن اب ایک مکان میں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا اور دوسرے میں ایک سب جج صاحب معہ اپنے بال بچوں کے رہتے تھے میری ماں نے جائداد کا سارا انتظام اپنے منشی کے سپرد کر دیا تھا جس کا نام عطا محمد تھا۔ یہ شخص ہم لوگوں کا دور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا اور بہت دیانت دار اور قابل اعتبار آدمی تھا۔ میری ماں کو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ عطا محمد کو کل سیاہ و سپید کا مالک بنا کر لکشمی پور میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ عطا محمد ہر ہفتہ ہم لوگوں کی خیریت دریافت کرنے آیا کرتا تھا اور جن ضروری معاملات میں میری ماں سے ہدایتیں لینا ہوتی تھیں لے لیتا تھا میری ماں اس سے برابر حساب فہمی کر لیا کرتی تھی اور ہر مہینہ میں جو تحویل ہوتی تھی اس میں سے حسب ضرورت عطا محمد کو دے کر باقی اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ میری ماں نے جس محنت اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے معاملات کی نگرانی کی ہے وہ ہر عورت کا کام نہیں ہے۔ اور میں اس کا سہرا اس کے سر نہیں رکھتا۔ وہ کچھ خلقی یا فطری طور سے ایسی مدبر نہیں تھی۔ زمانہ کے رنگ اور زندگی کے واقعات نے اس کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت اور نگرانی آپ کر سکے سچ ہے زمانہ سب سے زبردست

معلم ہے جس کا دیا ہوا سبق زندگی میں کبھی بھولتا نہیں۔

شہر "ب" میں مجھے زندگی زیادہ دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہونے لگی۔ اس سے پہلے میں افسردہ اور مضمحل رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ میں نے کبھی اپنی ماں کو شگفتہ دیکھا نہ باپ کو۔ اور بچوں کے مزاج میں شگفتگی یا افسردگی ماں باپ ہی کو دیکھکر پیدا ہوتی ہے۔ مگر اب میں روز بروز شگفتہ ہو رہا تھا۔ اسکول کی زندگی چہل پہل کی زندگی ہوتی ہے۔ اور کوئی اپنے غم میں گھلنے کی مہلت نہیں پاتا۔

میں نے اس پرشور زندگی کو اپنے حق میں پیغام امن پایا جس نے اپنے ہنگاموں میں مجھکو اس طرح محو کر لیا تھا کہ میں اپنے کو اپنی گزشتہ بارہ برس کی زندگی کو یکقلم بھول گیا تھا۔

آہ! وہ بھی کوئی زمانہ تھا!

میری ماں کو اب میری طرف سے قدرے اطمینان تھا ورنہ اس سے پہلے وہ میری ماتم زدہ صورت دیکھکر کڑھا کرتی تھی اور اکثر کہا کرتی تھی کہ " اللہ تم کو اپنی پناہ میں رکھے۔ تمھارے انداز اور تیور بچوں کے سے نہیں ہیں"۔ دوسروں کی بھی میرے متعلق یہی رائے تھی مگر اب میری ماں کو میرے انداز امید افزا معلوم ہو رہے تھے۔ اور وہ روز بروز مجھ سے کم مایوس ہوتی جاتی تھی۔ شاید وہ اپنے دل میں یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ

ساری نحوست میرے باپ کی پھیلائی ہوئی تھی جو خدا کی مصلحت سے دور ہو گئی اور اب اس کے اچھے دن آرہے ہیں جو سکون و اطمینان کے دن ہونگے مگر جب اچھے دن مقدر میں نہ ہوں تو آئیں کہاں سے۔

بہرحال میری ماں کو امیدیں تھیں اور اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ دنیا امید سے قائم ہے۔ نفس انسانی کے سیکڑوں مغالطوں میں سے ایک مغالطہ امید بھی ہے۔ مرنے والا مرتے دم تک یہی امید لگائے رہتا ہے کہ وہ بچ جائے گا یہ جانتے ہوئے کہ وہ مر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر زندگی کی امید نہ ہو تو نزع کی سختی باقی نہ رہے اس لیے کہ اگر جینے کی امید واقعی ٹوٹ جائے تو زندگی اور موت میں وہ کشاکش جس کا نام سکرات ہے بے انتہا ضعیف اور سست پڑ جائے۔

میں پھر اپنے فلسفہ کی روش پر چل نکلا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج بہت کچھ لکھوں گا مگر کچھ نہ لکھ سکا۔ میں بیٹھا بیٹھا تھک گیا ہوں اور جی سنسنانے لگا ہے۔ میرے لیے جی سنسنانا بری علامت ہے۔ یہ عموماً درد کے دورہ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ آج مجھے اپنے دل کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔ یوں تو میں ہر گھڑی اپنے "طوفان در آغوش" دل سے ڈرا کرتا ہوں اس لیے کہ میرا دل ہر دم ایک عجیب حالت میں رہتا ہے جس کو میں دائمی کھٹک کہہ سکتا ہوں۔ بہ قول شاعر:- ؎

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دِل ہے کیا قائمؔ
پر اِک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

قائمؔ کے لیے یہ شعر محض شعر ہے مگر میرے لیے واقعہ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ شعراء اب تک دِل کا جتنا رونا روتے رہے ہیں وہ سب میرے دل کا رونا ہے۔ مگر اب تو کچھ نہیں لکھا جاتا۔

---

۲۵ جنوری

"گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا"

آج میں نے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تو بیساختہ یہ مصرع زبان پر آگیا جس کو اب میں بار بار دھرا رہا ہوں۔ سچ ہے جس کا دل میرا سا ہو اس کی قسمت میں آرام کہاں!۔

پچھلی تاریخ کو لکھتے لکھتے میں تھک گیا تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹک سی پیدا ہوگئی تھی اور میرا جی سنسنانے لگا تھا۔ میں جاکر چارپائی پر لیٹ رہا تھا۔ آدھی رات جاتے جاتے مجھ پر وہی "الہامی دورہ" پڑگیا تھا اور میں نے پھر ایک جھلک اپنے "دم واپسیں" کی دیکھ لی۔ میرا عضو عضو پھوڑا ہو رہا ہے اور میں کم سے کم ایک ہفتہ تک چلنے پھرنے کے لائق نہیں ہوں گا۔ پڑے پڑے جی گھبرایا تو کچھ پڑھ کر جی بہلانا چاہا۔

یرے جی بہلانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ کتابیں بہت کچھ غم غلط کر دیتی ہیں
میں نے انگریزی کے مشہور طنز نگار سوفٹ (Swoift) کی
سوانح عمری اٹھالی۔ مجھے اِس ماہر طنزیات کے ساتھ فطری موانست
ہے۔ مزاج اور طبیعت میں یہ شخص مجھ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ اس
شخص کو بھی میری طرح اپنی ذات کے ساتھ ساتھ خلق اللہ سے تنافر تھا۔
اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا حالات نے اس کو ایسا بنا دیا تھا۔
مجھے بھی میری دنیا نے جیسا بنا دیا بن گیا۔

اَب تک جو کچھ میں لکھتا آیا ہوں اس سے پڑھنے والے یہی
سمجھیں گے کہ میں مبالغہ کو راہ دے رہا ہوں اور اپنے ساتھ ظلم کر رہا ہوں
آپ پوچھیں گے کہ میں اپنی ذات سے اس قدر تلخ کیوں ہوں اور
خواہ مخواہ اپنے کو بدترین خلائق کیوں ثابت کرنا چاہتا ہوں مگر میں کیا کروں
میں ایسا ہی ہوں۔ آگے چل کر آپ خود فیصلہ کر لیں گے کہ میں نے جو
اپنے کو ناکارہ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔

جس سب جج کا ضمناً اوپر ذکر کر آیا ہوں وہ ضلع باندہ کے رہنے
والے تھے اور اپنے گھر کے بڑے معزز رئیس تھے۔ ضلع "ب"
میں وہ خاص وقعت اور اِحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے
شہر میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا جو ان کو اپنے سے برتر اور زیادہ موقر

نہ سمجھتا ہوں ان کا نام علی محمد تھا ان کا خاندان کئی پشت سے تعلیم و تربیت میں قابل تقلید نمونہ سمجھا جاتا تھا ان کے گھر کی عورتیں بھی انگریزی زبان میں کافی مہارت رکھتی تھیں اور ان کے وہاں پردہ صرف برائے نام تھا۔

میری ماں سے بہت جلد ان لوگوں نے مخلصانہ مراسم پیدا کر لیے اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ میرے مکان میں رہتے تھے اور ان کے مکان اور میرے مکان کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی چند دنوں میں میری ماں اور سب جج صاحب کی بیوی کے درمیان بہناپا قایم ہوگیا اور اب ان کو یا ان کے بچوں کو ہم لوگوں سے کسی قسم کا تکلف باقی نہ تھا۔

سب جج صاحب کی ایک لڑکی بے انتہا خوبصورت تھی اس کا نام روشن آرا تھا وہ انٹرنس تک تعلیم پا چکی تھی اور ادبیات میں ذوق سلیم رکھتی تھی۔ اس کی عمر تقریباً اٹھارہ سال کی تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا شوہر عمر میں اس سے بہت بڑا تھا اور دایم الخمر تھا اسکو اپنی بیوی سے کوئی اُنس نہ تھا لیکن چونکہ وہ بہت بڑا تعلقدار تھا۔ اس لیے وہ آنکھ بند کر کے روشن آرا کو سو روپیے ماہوار دیدیتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہوگیا۔ بیچارے

سب جج صاحب نے داماد کا یہ رنگ دیکھا تو پہلے تو اپنی ساری کوشش اس بات پر صرف کی کہ داماد کو پند و نصیحت سے راہ راست پر لائیں اور اس کے اندر فرائض کا صحیح احساس پیدا کریں۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کی ساری کوشش رائیگاں ہو رہی ہے تو اپنی غلط اندیشی پر پچھتا کر اور صبر کر کے داماد سے اس کی اجازت مانگی کہ وہ ان کی بیٹی کو انھیں کے گھر رہنے دے۔ داماد نے اس کو اپنے حق میں بہتر سمجھا اور بلا کسی قسم کے چون و چرا کے بیوی کو اس کے والدین کے گھر رہنے دیا۔

آج تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میرے اندر وہ کیسی دلفریبیاں تھیں جنھوں نے مجھکو روشن آرا کے الطاف و عنایات کا خاص مرکز بنا رکھا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جس دن سے اس کے پڑوس میں آیا اسی دن سے اس نے مجھکو خاص التفات کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا میں بھی ایک نا معلوم کشش سے مغلوب ہو کر اس کی طرف کھنچنے لگا وہ بے انتہا جمیل تھی اور آج تک اس سے بہتر صورت میری نظر سے نہیں گزری ہے روایات و خرافات میں جتنی عورتوں کے تذکرے ہیں وہ سب اس وقت میرے سامنے ہیں لیکن روشن آرا اگر ان سب سے فایق نہیں تھی تو

کم سے کم ان سے ہم چشمی کا دعویٰ ضرور کرسکتی تھی۔ میں یونان کی وینس کا تصور کرتا ہوں تو روشن آرا سامنے آجاتی ہے فلورا اور آرورا کو یاد کرتا ہوں تو روشن آرا یاد آجاتی ہے۔ ہیبی کا نام لیتا ہوں تو روشن آرا کے خیال سے کلیجہ تھام لیتا ہوں۔ اندر سبھا کے پریوں کا خیال آتاہے تو روشن آرا آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ روشن آرا کی یاد آتے ہی ناسخ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

ناسخ کو حقیقی معنوں میں شاعر نہیں مانتا لیکن کم سے کم انھوں نے اپنی ساری عمر میں ایک شعر تو کہا ہی ہے جس کو میں ان کا حاصل عمر سمجھتا ہوں۔

چند ہی دنوں میں مجھے اس کے ساتھ عشق ہوگیا تھا اسکول کی خوش باشانہ زندگی نے میرے اندر خاصا ذوق اور ولولہ پیدا کر رکھا تھا اور اب میں اپنے تمام ذوق و ولولہ کو روشن آرا کے ساتھ صرف کر رہا تھا اور روشن آرا میرے ذوق و ولولہ کو بڑھا رہی تھی۔

مجھے پڑے پڑے لکھتے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوگیا اب مجھے تکان محسوس ہو رہی ہے سر میں چکر سا ہے آنکھیں مارے نقاہت کے

بند ہوتی جا رہی ہیں اور میں مجبور ہوں کہ لکھنا بند کر دوں اور پھر کسی دوسرے دن کی صحبت میں اپنی داستان کے کچھ اور ٹکڑے پیش کروں۔

---

۲۷ رجنوری

آج میری حالت بہت سنبھلی ہوئی ہے اور میں اس قابل ہوں کہ کچھ دیر تک میز کے پاس بیٹھکر اپنی سرگزشت کے چند صفحے حوالۂ قلم کرسکوں۔

روشن آرا کے ساتھ مجھے جو محبت تھی اس پر میری ماں اور روشن آرا کی ماں بیٹھکر اکثر باتیں کیا کرتی تھیں میری ماں کہتی" اسکو روشن آرا کے ساتھ عشق ہے" روشن آرا کی ماں اس کی ہاں میں ہاں ملاکر کہتی" ہاں اور روشن آرا بھی اس پر دم دیتی ہے" آہ یہ زندگی کا وہ دورِ معصومیت تھا جبکہ ہر گناہ کو انتہائے معصومیت کی دلیل سمجھا جاتا ہے اس زمانہ میں روشن آرا کے ساتھ میرا عشق انتہائی بھولا پن سمجھا جاتا تھا اور اس پر لوگ ہنس ہنس کر اس طرح باتیں کرتے تھے کہ گویا بڑی خوشی کی بات ہے ہاں یہ وہی عشق تھا جس کو

جوانی میں جوانی کے دیوانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کا علی الاعلان نام نہیں لیتے۔ میں یہ دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ لوگ میری اور روشن آرا کی باہمی محبت کو تحسین اور ستایش کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں لیکن روشن آرا اس تحسین اور ستایش سے اتنا شگفتہ نہیں ہوتی تھی جتنا میں ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اسلئے کچھ افسردہ اور مضمحل ہو جاتی تھی۔

افتاد طبیعت کے لحاظ سے روشن آرا بالکل میرے قدم بقدم تھی وہ بھی اتنا ہی کم سخن اور کم آمیز تھی جتنا کہ میں تنہائی اور فکر و تامل سے اس کو بھی اسی قدر انس تھا جس قدر مجھکو۔ کتب بینی کی اس کو بھی اسی قدر لت تھی جس قدر مجھکو۔ ادبی مذاق اس کے اندر بھی اتنا ہی ستھرا تھا جتنا کہ میرے اندر۔

اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے دو جلیس و رفیق ایک دوسرے کے لیے کیا ہوں گے ہم کو ایک دوسرے کا اچھا خاصا سودا ہو گیا تھا اور دن میں جتنی دیر تک ہم مجبوراً الگ رہتے ایک دوسرے کے لیے بیچین رہتے۔

میں تو خیر اسکول کی مصروفیتوں میں بہلا بھی رہتا تھا۔ لیکن روشن آرا دس بجے سے چار بجے تک گھڑیاں گنتی رہتی تھی اور اگر

کہیں کسی دن اسکول میں کھیلنے کی باری ہوتی اور شام کے وقت کھیلنے چلے جاتا تو پھر تو دونوں کے لیے مصیبت ہی ہو جاتی۔

اسی طرح دو سال گزر گئے اور ہماری طرز روش میں سرِمو فرق نہ آیا میں اپنی فرصت کا زیادہ حصہ روشن آرا کی بغل میں صرف کرتا تھا اور ایک لمحہ بھی مشکل سے ایسا گزرتا ہوگا جب کہ میں روشن آرا کو پیار نہ کرتا ہوں روشن آرا بھی مجھکو جی کھول کر پیار کرتی تھی۔

ایک دن جبکہ شام کے وقت روشن آرا میرے مکان میں آئی ہوئی تھی اور میں روشن آرا کے ساتھ مکان کے پس پشت احاطہ میں تھا روشن آرا کی ایک غیر معمولی حرکت نے میرے اندر ایک بالکل نیا احساس پیدا کر دیا اور ایک اندوہناک امکان میرے پیش نظر ہو گیا بہار کا شاداب اور شگفتہ کن موسم تھا ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے چڑیاں چہچہا رہی تھیں ہر چہار طرف نشاط اور تازگی پھیلی ہوئی تھی میرے اندر بھی ایک نشاط پیدا ہوا اور میں نے حسب معمول روشن آرا کو پیار کرنا چاہا روشن آرا آج خلاف عادت کچھ ہچکچائی میں نے حیرت سے اس کو دیکھا اور پوچھا "کیوں آج کیا بات ہے کچھ مجھ سے خفا ہو" روشن آرا سوچ میں پڑ گئی وہ آج روز سے زیادہ مضمحل تھی اور اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی اندرونی تکلیف کو

برداشت کرنے کی کوشش کر رہی ہے یوں تو معمولاً بھی اس کی صورت کچھ کم غمگین اور سوگوار نہیں تھی لیکن آج اس کی غمگینی بہت بڑھی ہوئی تھی میں نے اپنا سوال پھر دھرایا تو اس نے کہا۔

" منظر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تمھارا مجھکو اس طرح چومتے اور لپٹاتے رہنا کب تک بچپن سمجھا جائے گا۔ تمھاری عمر پندرہ برس سے زیادہ کی ہے ابھی تک لوگ اس لیے اعتراض نہیں کرتے تھے کہ تم کو لوگ بچہ سمجھتے تھے مگر اب تم بچپن کی منزل سے آگے بڑھ رہے ہو اور اب ہمارا اس طرح ہر وقت ایک دوسرے سے لپٹے رہنا دنیا کی نگاہوں میں معیوب ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں نے کہا " یہ سب باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں تم کو شاید اب مجھ سے اتنی گہری محبت نہیں ہے تم رفتہ رفتہ میری محبت کو کم کر رہی ہو "

" نہیں منظر نہیں " روشن آرا نے کہا اور بیساختہ مجھ سے لپٹ کر مجھے پیار کرنے لگی " تم میری حق تلفی نہ کرو میں تم کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں اور عمر بھر چاہتی رہوں گی لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا کے رسوم و قیود کی رو سے نہ مجھے تم کو پیار کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ تمھیں مجھکو۔ میرا بس چلے تو مرتے دم تک تم کو کلیجہ سے لگائے رہوں مگر افسوس تو یہی ہے کہ میرا بس نہیں چل سکتا۔ ابھی آج ہی گھر کی ایک ماما اماں جان کو سمجھا رہی تھی کہ منظر اب بچہ نہیں ہے اور اس کا ہر وقت

روشن آرا کے پاس گھسا رہنا مناسب نہیں ہے۔

اماں جان نے اس وقت تو اس کی بات کو حقارت سے ٹال دیا لیکن مظہر وہ وقت دور نہیں کہ خود میری ماں اور تمھاری ماں کی یہی رائے ہو۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ ہم ایک دوسرے سے جیتے جی نہ بچھڑتے۔"

میں نے دیکھا کہ روشن آرا کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں تو میرا دل سنسنانے لگا۔ میں نے کہا۔

"کیوں روشن آرا تم تو اس طرح کڑھ رہی ہو کہ گویا تم پر کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہوگئی ہے یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا اتنا ملال ہو. تم اگر میری طرف سے اس کا اطمینان کرنا چاہتی ہو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ مرتے دم تک تمھاری محبت کو دل سے نہیں نکالونگا اور تم سے جدا نہیں ہوں گا۔"

میں نے یہ کہنے کو کہدیا لیکن نہ جانے کیوں خود میری طبیعت بھرآئی اور میں رونے لگا۔ روشن آرا سے یہ نہ دیکھا گیا اس نے فوراً اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور مجھے پیار کرکے کہنے لگی۔

"یہ کیا میں تو محض تم کو آزماتی تھی بھلا جب ہم ایک دوسرے کو دل سے چاہیں گے تو ہماری محبت کس کے مٹائے مٹ سکتی ہے تم تو

مرد ہو مردوں کا دل بھی کہیں ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی بات پر رونے لگیں خیر آج مجھے اطمینان ہو گیا کہ تم مجھکو واقعی چاہتے ہو اور بری طرح چاہتے ہو۔"

روشن آرا اب مسکرا رہی تھی اور مجھ سے پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی لیکن میرے دل میں ایک خلش پیدا ہو گئی تھی جو باقی رہ گئی۔

میری طبیعت آج بہت ہلکی تھی اور میں یہ سوچ کر بیٹھا کہ دیر تک لکھوں گا اور بہت کچھ لکھوں گا۔ لیکن شامت ہو تو ایسی ہو کہ آج ہی ایک صاحب کو میری عیادت کا شوق ہوا یہ صاحب میرے دور کے رشتہ دار ہیں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان کو دراصل اس کی پروا نہیں ہے کہ میں بیمار رہوں اور چند مہینوں کا مہمان ہوں لیکن آخر اس کو کیا کیجئے کہ عیادت اور بیمار پرسی بھی دنیا کے عواید رسمیہ میں سے ہے اور گاہے ماہے بیمار کا حال پوچھ لینا ایک زبردستی کا فرض سمجھ لیا گیا ہے خیر تو یہ حضرت میرا حال پوچھنے اور میری " جان کھانے " پہونچ گئے اور آتے ہی پوچھا۔

" کہئے کیسا مزاج ہے؟"

میں نے کہا " آپ کی دعا ہے" اور جلدی سے جس کاپی کو لکھ رہا تھا اس کو بند کر دیا۔ اب یہ حضرت بھول گئے کہ وہ میرا حال دریافت کر رہے تھے اور پوچھنے لگے " یہ کیا لکھ رہے تھے کیا کوئی نیا مضمون چھیڑ دیا ہے؟"

آپ اس حالت میں بھی اپنے اوپر رحم نہیں کرتے ۔ اسی دماغ سوزی نے تو آپ کی تندرستی کو غارت کرکے رکھدیا ہے ابھی چار دن ہوئے کہ آپ پر دورہ پڑا تھا اور آج نہ جانے آپ کب سے بیٹھے لکھ رہے ہیں ؟

سنا صاحب آتے ہی نصیحت شروع کر دی بھلا ان کو کیا معلوم کہ میں کیا لکھ رہا تھا اور کس بات پر دل خون کر رہا تھا ۔

بڑی دیر تک میرا سر کھانے کے بعد جب یہ حضرت چلے گئے تو میں نے چاہا کہ پھر سلسلہ شروع کروں اور کچھ اور لکھوں لیکن اَب طبیعت کسی طرح حاضر نہیں ہوتی اور اب میں مجبوراً بطور معذرت کے آپ لوگوں کو محض ان کی آمد کی اِطلاع دے کر اپنے روزنامچہ کو یہیں ختم کرتا ہوں ۔

---

۲۹ / جنوری

کل میں نے بہت طبیعت پر زور دیا مگر طبیعت موزوں نہیں ہوئی اور میں اپنی داستان حزیں سے کچھ نہ سُنا سکا ۔ میرے مہربان عیادت کو کیا آئے خواہ مخواہ میری طبیعت کو مکدر کر گئے ۔ ایسے ہی "چاہنے والوں سے" انسان پناہ مانگتا ہے ۔ میں نے جو کچھ پچھلی مرتبہ لکھا تھا اس کو کئی بار پڑھا اس امید میں کہ اس طرح شاید میری طبیعت میں

کچھ جولانی پیدا ہو جائے اور میں کچھ لکھ سکوں۔ مگر یہ بھی نہوا۔ آخرکار کچھ کچھ گنگنانا شروع کیا۔ خیال تھا کہ کچھ اشعار موزوں کروں گا۔ مگر طبیعت اپنی جگہ سے سرمو آگے نہ بڑھی اور نہ "رباعی" ہوئی نہ "غزل"۔

آج خدا خدا کر کے طبیعت حاضر ہوئی ہے اور میں لکھنے بیٹھ گیا ہوں دیکھئے آج کیا بلا نازل ہوتی ہے۔ دل ابھی سے دھڑک رہا ہے۔

روشن آرا کے ساتھ میری زندگی کا جو دور گزرا ہے وہ اگرچہ نہایت مختصر تھا لیکن تھا بے انتہا پُرکیف اور آج تک میرا یہ عالم ہے کہ ساری دنیا سے تنگ آچکا ہوں۔ زمانہ سے عاجز ہو گیا ہو۔ زندگی سے بیزار ہوں مگر روشن آرا کی یاد اسی طرح میری روح کا دامن پکڑے ہوئے ہے اسکا خیال آتے ہی میرے اندر ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ واقعات زمانہ میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں اس لیے یہ انبساطی کیفیت دیر تک قایم رہنے نہیں پاتی۔ اگر اب میں اپنی زندگی کو زندگی کہہ سکتا ہوں تو بس اس لیے کہ

اِک تری یاد کو سینہ سے لگا رکھا ہے

مگر ایسی پرشور دنیا میں ایسی مجہول یاد کی اہمیت ہی کیا۔ روشن آرا کا مجھپر اتنا مستقل اور پائدار اثر صرف اس لیے ہے کہ وہ یہ میری پہلی محبت تھی جو اس وقت شروع ہوئی جبکہ انسان کی طبیعت سب سے زیادہ

اثر پذیر ہوتی ہے۔ بچپن اور شباب کے درمیان انسان کے دل و دماغ پر جو نقش بیٹھتے ہیں وہ ایسے ہی گہرے اور پائدار ہوتے ہیں۔ میری اس محبت کی مثال پھاگن اور چیت کے درمیانی موسم کی ہے جبکہ موسم بہار کی ابتدا ہوتی ہے اور باغ و صحرا مائل بہ شباب ہوتے ہیں۔ یہ وہ موسم ہوتا ہے جبکہ خواہ مخواہ افسردہ سے افسردہ دلوں میں ایک نشاط آگین کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تھوڑے عرصہ کے لیے زندگی جو سر تا سر رنج و غصہ اور محنت و الم ہے دارالسرور معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری محبت کا یہ دور اسی موسم نشاط سے مشابہ تھا۔ اب بھی جب کبھی اطمینان کے ساتھ اس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد کرتا ہوں تو باوجود اس کے دل میں ہوکیں اٹھنے لگتی ہیں اپنی رگوں میں ایک انبساطی اُبھار محسوس کرنے لگتا ہوں۔

لیکن میری زندگی کی یہ بہار صرف چند دنوں کی تھی جو بہت جلد گزر گئی اور مجھکو پھر کبھی وہ انبساط نصیب نہیں ہوا۔ خواب میں بھی میرے فرشتوں کو یہ گمان نہ تھا کہ اتنا جلد اور اس طرح میرے بہار کے دن گزر جائیں گے۔ اور پھر پلٹ کر نہ آئیں گے۔

اب میں روشن آرا کی غم زدہ صورت کو یاد کرتا ہوں تو ماننا پڑتا ہے کہ میری "مستقبل بینی" اور روشنضمیری کے باوجود وہ مجھ سے زیادہ

دور اندیش اور عاقبت فہم تھی۔ مگر میری روشنضمیری نے تو حال میں زیادہ جلا پائی ہے۔ جب سے کہ مجھ پر درد کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ اِس سے پہلے تو بس کبھی کچھ وہم سا ہو جایا کرتا تھا جس کو میں کبھی "بصیرت غیب" سے نہیں تعبیر کر سکتا تھا بہر حال روشن آرا مجھ سے زیادہ ذکی الحس اور سریع الفہم تھی۔ وہ پہلے سے دیکھ رہی تھی کہ ہماری محبت کہاں ختم ہونے والی ہے اور کس طرح ختم ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ ملول اور افسردہ رہتی تھی۔

روشن آرا کے ساتھ تین سال بڑے مزہ سے گزرے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زندگی نام ہے کیف و سرور کا اور جو لوگ زندگی کا رونا روتے ہیں وہ دراصل زندگی کی لذّتوں سے بہرہ ور ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ممکن ہے میرا اس زمانہ کا یہ خیال اب بھی کلیتہً صحیح ہو اور اب میں جو زندگی کا دکھڑا رو رہا ہوں اس پر بھی لوگ یہی کہیں کہ میں نا اہل ہوں اِس لیے بدنصیب ہوں۔ اور ممکن ہے لوگوں کا یہ کہنا سچ بھی ہو۔ مگر اَب تو میں کسی کلیہ سے نہ بحث کرنا چاہتا اور نہ اس سے مجھے کوئی سروکار ہو سکتا۔ میں تو اب صرف اس کو کلیہ سمجھتا ہوں جو میری اپنی زندگی پر صادق آئے اور میری زندگی نے مجھے جو سبق دیا ہے وہ صرف یہ ہے۔ ؎

"یاں عیش کے پردے میں چھپی دلشکنی ہے
ہر بزم طرب جوں مژہ برہم زدنی ہے"

میں نے اپنے سترہویں سال میں انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ یہ امتیاز یقیناً روشن آرا کی صحبت کا فیض تھا جس نے میرے اندر غیر معمولی ذوق و ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ خیر وہ تو وہ زمانہ تھا جس کو "عیش زمان عاشقی" کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب تک میرے اندر جو ادبی ذوق و صلاحیت ہے وہ روشن آرا کی دین ہے۔ اس نے اور اس کی محبت نے مجھے شاعر بنایا۔ ادیب بنایا۔ فلسفی بنایا۔ غرض کہ اس وقت میں جو کچھ ہوں۔ روشن آرا ہی کی بدولت ہوں۔ ہاں تو میں انٹرنس کا امتحان دے کر ماں کے ساتھ تعطیل میں گاؤں پر چلا گیا۔ ہم لوگ اس سے پہلے بھی اکثر چھٹیوں میں گانوں پر چلے جایا کرتے تھے لیکن چونکہ شہر گانوں سے بہت قریب تھا اس لیے میں ہر تیسرے چوتھے دن روشن آرا سے ملنے آجاتا تھا اور یہ دوران فراق نہ مجھے زیادہ شاق گزرتا تھا نہ روشن آرا کو روشن آرا ہمیشہ مجھکو ہنسی خوشی رخصت دیدیا کرتی تھی مگر اب کی دفعہ جب میں جانے لگا تو اس کے کئی دن پہلے ہی سے روشن آرا رنجیدہ اور دلگیر تھی۔ میں لاکھ اس کا سبب دریافت کرتا مگر اس نے کچھ بتایا نہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لاتی تھی۔ آخر کار جس دن

ہم لوگ روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دن شاید رَوشن آرا سے ضبط نہ ہوسکا۔ اس نے روکر کہا۔

" ٹھہر جاؤ۔ دیکھیں ہم کو پھر خدا ملاتا ہے یا نہیں " میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے کہا۔

رَوشن آرا آج کوئی میں پہلی مرتبہ تو اپنے گانوں پر جا نہیں رہا ہوں۔ میں اس سے پہلے بھی بارہا جا چکا ہوں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میرا جانا نہ جانا دونوں برابر ہیں۔ میں تعطیل کا بھی زیادہ تر حصہ یہیں گزارتا ہوں اور اب بھی گزارونگا۔ یا تم کو میری طرف سے اطمینان نہیں ہے ؟ اگر تمھارا یہی حال رہا تو میں اماں کو پہونچا کر دوہی دن میں یہاں واپس چلا آؤں گا "

" نہیں نہیں میرا یہ مقصد ہرگز نہیں" رَوشن آرا نے کہا اور ایک عجیب حسرت بھری نگاہ سے مجھکو دیکھنے لگی۔ میں نے اس وقت تو کچھ نہیں سمجھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ پہلے سے جانتی تھی۔ خیر میں ماں کے ساتھ لکشمی پور چلا آیا لیکن رَوشن آرا کو چھوڑ کر مجھے چین نہیں تھا۔

اَب کی دفعہ میرے دل پر بھی ایک غیر واضح اور مبہم گرانی تھی جس کی نہ میں تشریح کرسکتا تھا اور نہ اس کے کوئی معنے سمجھ میں آتے تھے۔ مجھے رہ رہ کر رَوشن آرا کی حسرت آلودہ نگاہیں یاد آرہی تھیں اور مجھ پر

ان نگاہوں کا اثر تھا اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا اثر ہے اور کیوں۔ بڑی مشکل سے میں نے دس دن لکشمی پور میں کاٹے۔ ماں کی خواہش یہ تھی کہ ابھی میں کچھ دن اور رہ لوں پھر اس کے بعد شہر جاؤں مگر اب مجھ سے ایک گھڑی بھی نہیں رہا جاتا تھا۔ مجھے تو وہ آگ جلا رہی تھی جس کی جلن سے میں روز پپیہے کو چلاتے ہوئے سنتا تھا۔ آج کل میرا بال بال پپیہے کا ہمنوا تھا۔ جس وقت وہ "پی پی" کا نعرہ لگاتا تھا اس وقت میرا دل اس کا ہم آہنگ ہوتا تھا اور میں اس کے "پی" اور اپنی روشن آرا کو ایک ہی ہستی کے دو نام سمجھنے لگتا تھا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب میرا سودائے خام ہے اور اس کا حاصل کچھ نہیں ہے!

میں صبح کی گاڑی سے شہر "ب" کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ بھر "دید جاناں" کی آرزو اور اس کی امنگیں میری رگوں میں ایک سرور آفریں اضطراب پیدا کیے ہوئے تھیں۔ لیکن جب منزل پر اترا تو معلوم ہوا کہ وہ ساری آرزو خواب تھی اور ساری امنگیں طلسم خیال۔

میں اپنا مختصر سامان سفر اپنے مکان میں رکھکر سیدھا سب جج صاحب کے دروازہ پر پہونچا۔ سب جج صاحب مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور مجھے بڑی محبت اور شفقت سے اپنے پاس بٹھا کر زنانخانہ میں کہلا بھیجا کہ

منظہر آئے ہوئے ہیں اُن کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ میں نے کہا۔

"پیغام کہلانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں خود جاکر اپنا مجسم پیغام بنوں گا۔ مجھے خالہ (میں روشن آرا کی ماں کو خالہ کہتا تھا) اور روشن آرا، کو یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آگیا ہوں اور وہ میرے آرام کا انتظام کریں۔ وہ تو خود میری ماں سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ مجھکو ان سے کیا توقع رکھنا چاہیئے"۔

میں نے دیکھا کہ سب جج صاحب میری گفتگو سے کچھ متفکر سے ہوگئے اور دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ کرسی سے اٹھے اور مجھ سے کہا "اچھا چلو اندر چلیں" — میں ان کے ہمراہ ہولیا۔

میں اندر پہونچا تو سب جج صاحب نے پکار کر کہا "منظہر آرہے ہیں" گویا میں کوئی نامحرم تھا۔ میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ روشن آرا سامنے سے اٹھکر دوسری دالان میں چلی گئی اور میری طرف سے آڑ کرکے بیٹھی۔ میں نے روشن آرا کی ماں کو طوعاً کرہاً سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ لیکن شاید اس وقت میری صورت میرے دل کی حالت کا آئینہ تھی۔ سب جج صاحب اور ان کی بیوی میری حالت کو سمجھ گئے۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا جس کے بعد روشن آرا کی ماں نے مجھ سے پیار کے لہجہ میں

مخاطب ہو کر کہا۔

"تم اس وقت یہ سوچ رہے ہو گے کہ روشن آرا اس وقت کی صحبت میں کیوں نہیں ہے۔ سچ ہے تین سال سے تم دونوں چولی دامن کی طرح ساتھ رہے ہو۔ اور اس کا تم کو جہاں تک ملال ہو بجا ہے۔ روشن آرا تم سے زیادہ دنیا کو دیکھ اور سمجھ چکی ہے۔ اس لیے وہ تم سے جلد تمام مجبوریوں کو سمجھ جائے گی۔ تم البتہ ابھی شاید نہ سمجھو۔

منظہر اب تم نام خدا جوان ہو رہے ہو۔ روشن آرا بھی جوان ہے اب تم دونوں کا اس بے تکلفی اور بے شعوری کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آنا جانا دنیا کے نقطۂ خیال سے معیوب ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ پردہ کی زیادہ پابندی نہیں کرتے اور آزاد خیال مشہور ہیں۔ مگر پھر بھی دنیا کے رسم و رواج سے باہر نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ روشن آرا کی سسرال والے اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ تم سے اس قدر بیباکی اور خلوص سے ملتی ہے یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ تم بچے ہو اور اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس وقت اگر بہن (میری ماں) یہاں ہوتیں تو وہ تم کو بہتر سمجھا سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے منظہر کہ آج روشن آرا ہماری صحبت سے الگ تھلگ بیٹھی ہے۔ پردہ تو ہمارے وہاں اب بھی ویسا ہی رہے گا جیسا اب تک رہا مگر اب مناسب یہ ہے کہ تم دونوں

اپنی اپنی جگہ اس کا خیال رکھو کہ دنیا کو تم پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔"

میں سب کچھ سر جھکا دم بخود سنتا رہا۔ اب مجھکو قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ روشن آرا ہمارے اختلاط و ربط کو کیوں اس قدر ناپائدار اور ناقابل اعتبار سمجھ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری ساری دنیا تہس نہس کر کے رکھ دی گئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس گھڑی سے میری اندرونی اور بیرونی زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا وہ آج تک نہیں گیا۔ اب شاید مرنے کے بعد ہی اس سے سکون ملے۔ لیکن مجھے اتنی جرأت نہوئی کہ میں اپنی حالت کا کوئی اظہار اپنی زبان سے کر دیتا۔ میں نے کہا۔ "ہاں خالہ سچ کہتی ہو انسان رسم و رواج سے ایسا ہی مجبور رہے۔" اس کے تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھکر اپنے مکان میں چلا آیا۔ اور اپنے کو ایک کمرہ میں بند کر کے بیٹھ رہا۔ یہ عمر میں پہلا دھکا تھا۔ میرا کلیجہ منھ کو چلا آرہا تھا۔ اور آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے۔ میں گھنٹوں روتا رہا۔ روشن آرا سے میں جدا کیا ہوا تھا کہ میری زندگی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ جب میں خوب رو لیا۔ اس قدر کہ میرے چہرہ پر آماس سا آگیا تو میرے دل کی آگ بہت ٹھنڈی ہو گئی اور میں کسی قدر ٹھنڈے دل سے صورت حال پر غور کرنے لگا۔ رونا بھی کیسے مزے کی دارو ہے۔ بعض اوقات اس سے وہ فرحت ہوتی ہے جو شراب سے بھی ممکن نہیں اور اپنے دل کا

بار ہلکا کرنے کی تو اس سے بہتر کوئی تدبیر ہی نہیں۔کسی نے کیا سچ کہا ہے ؎

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور
غم دِل کا کوئی علاج نہیں

مجھے یقین تھا کہ روشن آرا کی سسرال والوں کا اعتراض جو مجھ سے بیان کیا گیا وہ محض ایک بہانہ ہے۔یہ لوگ خود اب مجھ کو اور روشن آرا کو اکٹھا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے کس کس طرح کی کلفتوں میں سارا دن گزارا اگر دن میں کوئی گاڑی لکشمی پور کو آتی ہوتی تو میں فوراً بھاگ آتا مگر مجھے شام تک صبر وضبط کے ساتھ انتظار کرنا تھا میری دماغی تکان کی کوئی انتہا نہ تھی۔میں نے ملازم سے کہا۔

دیکھو اگر سب جج صاحب کے وہاں سے کوئی مجھے بلانے آئے تو کہہ دینا کہ بہت تھک گئے ہیں اور بےخبر سو گئے ہیں اور حکم ہے کہ کوئی جگائے نہیں۔ اگر کھانے کے لیے بلایا جائے تو کہہ دینا کہ کھانا نہیں کھائیں گے۔" یہ کہہ کر میں واقعی سو گیا اور خبر نہیں کہ مجھے کب سب جج صاحب کے یہاں سے بلانے کے لیے آدمی آیا۔ میری آنکھ ۶ بجے شام کو کھلی اور وہ بھی ملازم نے ڈرتے ڈرتے جگایا۔گاڑی کا وقت نکل گیا تھا۔اب

مجھے آٹھ بجے رات تک انتظار کرنا تھا۔

ملازم نے میز پر سے خط اٹھا کر مجھکو دیا اور کہا۔

" یہ خط سب جج صاحب کی لڑکی کے پاس سے آیا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ اس کو اپنی ماں کو دیدیجئے گا۔" میں نے دیکھا تو لفافہ پر بجائے میری ماں کے نام کے میرا نام لکھا ہوا تھا۔ تحریر روشن آرا کی تھی میں نے ملازم کو چائے تیار کرنے کے لیے روانہ کیا اور خط کھول کر پڑھنے لگا۔

" میرے سوگوار مظہر۔

آج تمہارے دل پر کیا گزر گئی ہوگی آج یہاں آکر بغیر مجھ سے ملے چلے جا رہے ہو۔ اس کا مجھکو بھی صدمہ ہے لیکن مظہر اماں نے سچ کہا ہے۔ میں ایسے ایسے صدموں کو معمولی واقعات کی طرح برداشت کر لے جاسکتی ہوں۔ ذرا سوچو اتنی سی عمر میں مجھے در اصل کبھی دو گھڑی بھی جی کھولکر ہنسنا نصیب نہیں ہوا ہے خوشی میری دنیا کی لغت کا لفظ نہیں ہے۔ میں اتنے دنوں جو تمہارے سامنے ہنستی کھیلتی رہی تو یہ بھی سمجھتی رہی کہ یہ وقتی چہل پہل ہے

جو زمانہ کے چلتے ہمیشہ قایم نہیں رہ سکتی۔ میں پہلے سے
اپنے کو اس گھڑی اور دھکے کے لیے تیار کیے ہوئے
تھی اس لیے آج میری حالت اس قدر نہیں بگڑی
جس قدر کہ تمھاری۔ اور میں اپنی حالت کو اپنی طبیعت
پر زور دیکر سنبھالے بھی رہی۔ میں اگر چاہتی تو سب
کے سامنے آکر کم سے کم تم سے مل سکتی تھی اور تم کو
اپنی صورت دکھا سکتی تھی۔ مگر میں نے سوچا کہ آخر
اس سے فائدہ؟ یہ تو اپنے کو اور تم کو اور بھی بیچین
کرنا ہوتا۔ جب ہمارے لیے ایک دوسرے کی محبت
کرنا اور ایک دوسرے پر جان دینا معیوب اور
ممنوع ہے تو پھر ملنا ملانا بھی بے کار ہے۔ اور مظہر
غور کرو تو یہ ماننا پڑے گا کہ آج نہیں تو کل ہم کو
ایک دوسرے سے بچھڑنا ہی پڑتا میں بیاہی عورت
ہوں اور اپنی مالک نہیں ہوں۔ یہ اور بات ہے
کہ میرا بیاہی ہونا اور بیوہ ہونا سب برابر ہے ہاں
تو تم چار دن میں بسلسلہ تعلیم کہیں نہ کہیں مجھکو
چھوڑ کر چلے ہی جاتے۔ دوسری طرف میرا بھی

آہ! کیا بتاؤں روشن آرا میں تجھکو دراصل کبھی نہیں بھولا کچھ دنوں تک یہ دھوکا ضرور ہو گیا تھا کہ میں تجھکو بھول گیا۔ اس فریب کی سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔

میرا ملازم چائے تیار کرنے نہیں پایا تھا کہ روشن آرا کا بھیجا ہوا ناشتہ پہونچ گیا اور مجھے برے بھلے اس کو حلق کے نیچے اُتارنا پڑا اس کے بعد فوراً ہی میں نے نوکر سے کہا۔

"تم بستر وغیرہ لیکر اسٹیشن چلو۔" اور میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بڑی بڑی مشکل سے اپنے ملاقاتیوں سے ملنے میں گزارے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ایک آخری نگاہ روشن آرا کے مکان پر ڈالی اور روتا ہوا دل لیکر یہ شعر پڑھتا ہوا چلا آیا۔ ؎

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

آج میں اپنی جھونک میں بہت زیادہ لکھ گیا اور اب جو دیکھتا ہوں تو سر چکرا رہا ہے۔ اور نہ جانے کب سے چکرا رہا ہے۔ اپنی محویت میں کچھ محسوس نہیں کیا۔ مگر اب قلم رُک گیا۔ اور میں بھی تکان محسوس کرنے لگا۔ دیکھئے اب پھر اپنی داستان محرومی سنانے کی کب نوبت آتی ہے۔

۶؍فروری۔

ایک ہفتہ سے میرا دل برابر ڈوب رہا ہے اور کسی طرح مجھ پر دورہ نہیں پڑتا۔ ہلکی ہلکی سی کسک ہو کر رہ جاتی ہے کہنے کو میرے سینے میں بھی دل ہے۔ مگر آپ کیا جانیں کیسا دل ہے بس ایک پکا پھوڑا سمجھیے۔ آہ! شاعر نے میرے ہی دل کے متعلق کہا ہے۔ ؎

"پہلوے عاشق بیدل میں بس اک آبلہ ہے
ان کو کیا کہیئے جو رکھدیتے ہیں تہمت دل کی"

اس شعر کے زبان پر آتے ہی مجھے اس غزل کا مطلع یاد آگیا۔ جب مجھ پر دورہ پڑتا ہے تو میری یہی حالت ہوتی ہے۔ ؎

"جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوے غمناک سے رخصت دل کی"

میں ہر "دورہ" کو اپنے "دل کی رخصت" سمجھتا ہوں۔ مگر دل کمبخت ایسا بے حیا ہے کہ کسی طرح رخصت نہیں ہو چکتا۔ آج بھی میرے دل کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے مگر چونکہ کوئی دورہ نہیں پڑا ہے۔ لکھنے بیٹھ گیا ہوں اس لیے کہ اب جلد مجھے اپنی سرگذشت کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنا ہے۔

میری زندگی کی وہ روداد جس کا تعلق روشن آرا سے ہے مختصراً یوں بیان کی جا سکتی ہے:۔

" دیدہ ام نیم نگاہے کہ بدیدن نہ رسد "

میری داستان کے اس ٹکڑے کا اس سے زیادہ جامع اور بلیغ اجمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد میری زندگی کا بالکل نیا باب کھلتا ہے۔

میری تین ماہ کی تعطیل کی روداد چونکہ غیر دلچسپ اور تھکا دینے والی ہے اس لیے اس کو بہت مختصر کر کے بیان کرتا ہوں۔ ہفتوں تک تو میرا دماغ مفلوج سا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا اور مجھکو کیا کرنا چاہیے۔ لیکن آخرکار میرے اندر خود بخود ایک توانائی پیدا ہوئی۔ وہ توانائی جو مایوسی اور سپردگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مجھکو کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا اور میں اپنے ہمسنوں میں اکثروں سے زیادہ پڑھا لکھا تھا لیکن روشن آرا کی صحبت میرے اس خداداد ذوق علم و ادب کے لیے تازیانہ ہو گئی تھی۔ اس کے مذاق نے میرے مذاق کو بھی رچ دیا تھا۔ سب سے بڑی دولت جو مجھکو روشن آرا سے ملی وہ یہی ہے اسی علمی شغف نے میری کلفتِ غم کو بہت جلد قابل برداشت بنا دیا میں کتابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ روشن آرا کا آستانۂ ناز چھوٹا تو میں منروا کے مندر کا پجاری بن گیا اور اس سے میرے جذبات میں روز بروز

وسعت اور سنجیدگی آتی گئی۔

اسی تعطیل میں مجھ پر وہ مصیبت نازل ہوئی جو آج تک مجھ پر مسلط ہے۔ بچپن سے میرا دل ضعیف تھا۔ طبیبوں نے مجھکو ہول دل بتایا تھا۔ میری ماں کو اس کی بڑی فکر تھی لیکن جب سے روشن آرا نے میری زندگی میں قدم رکھا تھا اس وقت سے میرے ہول دل کی ساری علامتیں غائب ہوگئی تھیں۔ اور اب جو روشن آرا سے بچھڑا تو اسی ہول دل نے "درد دل" بن کر مجھ پر غلبہ کیا۔ یہ عمر میں پہلا دورہ تھا جس کے بعد سے مجھ پر کبھی کبھار دورے برابر پڑتے رہے ہیں لیکن اس کثرت سے مجھ پر دورے کبھی نہیں پڑے جس کثرت سے دو سال سے پڑ رہے ہیں جب سے مجھ پر "درد دل" کے دورے پڑنے لگے اسی وقت سے باقاعدہ میری "روشن ضمیری" یا غیب دانی کے بھی دورے پڑتے رہے۔

میری ماں کو اب نئی تشویش شروع ہوئی۔ اس کو مجھ سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ وہ مجھے جی کھول کر تعلیم دلانا چاہتی تھی اور مجھے الہ آباد بھیجنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ میرے دورے نے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کرکے رکھ دیئے۔

میں نے اس کو بہت سمجھایا۔ بہت ڈھارس دلائی لیکن اس کی افسردگی دور نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں میرے ایک دور کے رشتہ دار

آ گئے جن کا نام نذیر احمد تھا اور جو الہ آباد میں نباتیات کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بھی میری ماں کو بہت تسلّی دی اور کہا۔

منظر الہ آباد کچھ غیر کے گھر نہیں رہیں گے۔ ان کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا اور پوری دیکھ بھال کی جائے گی۔ اگر خدانخواستہ کبھی بیمار پڑے تو بہترین اطبا سے مشورہ لیا جاسکتا ہے۔ آپ ان کو ضرور الہ آباد تعلیم کے لیے بھیجئے۔ اس کا ذمہ میں لیتا ہوں وہاں ان کی تندرستی بہتر رہیگی۔"

نذیر بھائی ہی نے مجھ کو مشورہ دیا کہ میں سائنس اور بیالوجی (حیاتیات) پڑھوں۔ میں نے نئے موضوعات کے نام سنے اور اُن پر نذیر بھائی سے کچھ بحث ہوئی تو خوشی سے راضی ہوگیا۔

میری ماں کو بھی نذیر کے اطمینان دلانے سے بہت کافی حد تک اطمینان ہوگیا اور وہ مجھکو الہ آباد بھیجنے کے لیے پھر تیار ہوگئی اِس کا بس چلتا تو وہ الہ آباد بھی میرے ساتھ چلتی مگر دنیا کی مصلحتیں سدراہ ہیں۔ اگر وہ لکشمی پور سے اتنی دور جاکر رہتی تو میرا گھر دن دوپہر لٹ جاتا۔ مجبوراً اس نے مجھکو خدا کو سونپا اور نذیر بھائی کے ساتھ روانہ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

مجھے الہ آباد جانے کی اِتنی خوشی ہوئی کہ میں یہ بھی بھول گیا کہ مجھے کیا پڑھنا ہے میرے متخیلہ نے اپنا کام شروع کر دیا اور میں نے یہ سوچنا

شروع کیا کہ الہ آباد کیسا شہر ہوگا۔ دفعتاً مجھ پر ایک خواب سی کیفیت طاری ہوئی اور پھر میں الہ آباد کی سول لائنس کی سیر کر رہا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے نذیر بھائی کا مکان، کالج کی عمارت الفریڈ پارک، خسرو باغ جمنا کا پل متحرک تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ لیکن سب سے زیادہ دلفریب منظر یہ تھا کہ ایک اُنیس بیس سال کی لڑکی اپنی تمام رعنائیوں اور خوش ادائیوں کے ساتھ میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں اس سے بھاگ رہا ہوں۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کا گرویدہ ہوں لیکن حسرت کے ساتھ آہیں کر کر کے اس سے بھاگ رہا ہوں۔ وہ اتنی بھولی، اتنی خوبصورت ہے کہ میں سمجھتا تھا اس کو چاہنا اس کے نازک حسن کو برباد کرنا ہے مگر وہ میرا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ میں رام ہوگیا اور پھر .... پھر اسی عورت نے مجھے غارت کر کے چھوڑ دیا۔

یہاں پہونچ کر میری رگوں میں ایسا تشنج ہونے لگا کہ میں سراسیمہ ہو کر دنیائے واقعات میں آگیا۔ میں نے اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر سوا اپنے کمرہ کی چار دیواری کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نیم خواب میں مجھے ایسی مشقت اٹھانی پڑی تھی کہ پسینہ سے تر ہوگیا تھا۔ اور دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اب اس کے خیال سے بڑی دیر تک

کانپتا رہا۔ اس سے پیشتر بھی مجھے بارہا ایسا اتفاق ہوا تھا کہ کسی نئے شہر کا نام سنا اور اسی عالم میں اس کو دیکھ لیا پھر جب اس شہر کو سچ مچ دیکھتا تو بجنسہٖ ویسا ہی پاتا لیکن ایسا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کئی دن تک اس کے اثرات میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ یہاں تک کہ لکھنے پایا تھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یکایک دل ڈوبا جا رہا ہے اور اب میں احتیاطاً چارپائی پر لیٹنے جا رہا ہوں۔

---

۸ ر فروری

دو دن تک میں نے قصداً آرام کیا اگرچہ لکھنے کے لیے بار بار طبیعت اُبھرتی تھی — میں یہ اندیشہ لیے ہوئے تھا کہ کہیں مجھ پر دورہ نہ پڑ جائے اور پھر ہفتوں لکھنے کے قابل نہ رہوں اور مجھے ابھی بہت لکھنا ہے، اسی خیال سے میں اپنی طبیعت کے اُبھار کو روکے رہا۔ مگر آج میں بالکل اچھا ہوں اور اب طبیعت نہیں مانتی۔

میں الٰہ آباد پہونچ گیا، شہر کا ہو بہو وہی نقشہ تھا۔ یہاں کی معاشرت بالکل وہی تھی جو میں اس روز اپنے کمرہ میں دیکھ چکا تھا۔ مجھے اس پر حیرت تو نہیں ہوئی لیکن وہ کھٹک دل میں پھر تازہ ہوگئی اور

میں آنے والی گھڑیوں سے ہر دم اندیشہ ناک رہنے لگا۔
مجھے اپنی طالب علمی کی زندگی کے متعلق زیادہ کہنا نہیں ہے میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ایسے ماہر فن استادوں اور ایسے چمکیلے اور دلکش آلات سے نہ جانے کیا کیا فائدے اٹھاتا مگر میں شامت زدہ کچھ نہ کر سکا مجھے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ کسی طرح میرے حلق کے نیچے نہ اترتا تھا۔ آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ "زاویۂ منشور" یا "زاویۂ انحراف" کس عنقا کا نام ہے یا "کاربن گیس" کس کو کہتے ہیں۔ میں پھول کو بلبل کا معشوق سمجھتا تھا اور مجھکو "خضرہ" اور "بقچہ" کی تحقیق میں ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا پڑتا تھا میں زندگی کو ایک ازلی راز تصور کرتا تھا اور مجھے سارے دن سابقہ رہتا تھا مینڈک اور خرگوش کے سنگدانہ پتہ اور بیضہ دان وغیرہ سے سنائی نے مجھکو بتایا تھا کہ دل ایک "منظر ربانی" ہے اور عمل جراحی کے بعد معلوم ہوا کہ دل نام ہے ایک "پارۂ گوشت" کا جو غلاف میں ملفوف ہوتا ہے۔ میرا دل کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا حال سنکر ہمارا دل دکھ گیا تو ہماری مراد اسی دل سے ہوتی ہے جو سینہ کے اندر غلاف میں محفوظ ہے۔
مختصر یہ کہ میری زندگی عجیب تناقصات میں الجھی ہوئی تھی مجھے بہت جلد اس کا احساس ہو گیا۔ اور میں نے دو ہی تین ماہ کے اندر اپنے

موضوعات بدل دیے اور تواریخ، منطق اور فارسی ادبیات لے لی اور اب میری زندگی کے صرف دو دلچسپ مشغلے تھے یعنی ادبیات کا مطالعہ اور سینما۔

الہ آباد میں میرا صرف ایک دوست تھا۔ اس کا نام رتن ناتھ تھا۔ ادب و شاعری کا وہ بھی دلدادہ تھا، کالج بھر میں وسعت مطالعہ اور وقت نظر کے اعتبار سے وہ ایک شخص تھا، ماشاءاللہ صورت بھی دلکش تھی، اس کو دیکھکر مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ "الف لیلیٰ" کے شاہزادہ احمد اور شاہزادہ زین الصنم کی صورت ایسی ہی رہی ہوگی، میں رتن کے ساتھ اکثر سینما جایا کرتا تھا۔

رتن میں ایک بڑی بُری عادت یہ تھی کہ وہ کبھی کبھی شراب پی لیا کرتا تھا۔ اس کو زندگی میں کچھ ایسی مایوسیاں ہوئی تھیں جن کو بھول جانے کے لیے اس کو اکثر "یک گونہ بیخودی" کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی سنگت کا اثر کہیئے یا خود اپنی نحوست کچھ دن میں مجھے بھی یہ لت لگ گئی اور اب ہم جب سینما جاتے تو "ساغر و مینا" کا شغل ضرور رہتا۔

ایک دن رتن میرے پاس آیا اور کہنے لگا "منظہر چلو آج سینما دیکھ آئیں تماشہ اچھا ہے اور نہ بھی اچھا ہوتا تو آج میں ضرور جاتا میں آج پریشان نہ جانے کیوں معمول سے زیادہ ہوں کچھ خفقان سا ہو رہا ہے

میں آنے والی گھڑیوں سے ہر دم اندیشہ ناک رہنے لگا۔

مجھے اپنی طالب علمی کی زندگی کے متعلق زیادہ کہنا نہیں ہے میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ایسے ماہر فن استادوں اور ایسے چمکیلے اور دلکش آلات سے نہ جانے کیا کیا فائدے اٹھاتا مگر میں شامت زدہ کچھ نہ کر سکا مجھے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ کسی طرح میرے حلق کے نیچے نہ اترتا تھا۔ آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ "زاویۂ منشور" یا "زاویۂ انحراف" کس عنقا کا نام ہے یا "کامل گیس" کس کو کہتے ہیں۔ میں پھول کو بلبل کا معشوق سمجھتا تھا اور مجھکو "خضرہ" اور "بقچہ" کی تحقیق میں ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا پڑتا تھا میں زندگی کو ایک ازلی راز تصور کرتا تھا اور مجھے سارے دن سابقہ رہتا تھا مینڈک اور خرگوش کے سنگدانہ پتہ اور بیضہ دان وغیرہ سے سنائی نے مجھکو بتایا تھا کہ دل ایک "منظر ربانی" ہے اور عمل جراحی کے بعد معلوم ہوا کہ دل نام ہے ایک "پارۂ گوشت" کا جو غلاف میں ملفوف ہوتا ہے۔ میرا دل کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا حال سُنکر ہمارا دل دکھ گیا تو ہماری مراد اسی دل سے ہوتی ہے جو سینہ کے اندر غلاف میں محفوظ ہے۔ مختصر یہ کہ میری زندگی عجیب تناقصات میں الجھی ہوئی تھی مجھے بہت جلد اس کا احساس ہو گیا۔ اور میں نے دو ہی تین ماہ کے اندر اپنے

موضوعات بدل دیے اور تواریخ، منطق اور فارسی ادبیات لے لی اور اب میری زندگی کے صرف دو دلچسپ مشغلے تھے یعنی ادبیات کا مطالعہ اور سینما۔

الہ آباد میں میرا صرف ایک دوست تھا۔ اس کا نام رتن ناتھ تھا۔ ادب و شاعری کا وہ بھی دلدادہ تھا، کالج بھر میں وسعت مطالعہ اور وقت نظر کے اعتبار سے وہ ایک شخص تھا، ماشاءاللہ صورت بھی دلکش تھی، اس کو دیکھکر مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ "الف لیلیٰ" کے شاہزادہ احمد اور شاہزادہ زین الصنم کی صورت ایسی ہی رہی ہوگی، میں رتن کے ساتھ اکثر سینما جایا کرتا تھا۔

رتن میں ایک بڑی بُری عادت یہ تھی کہ وہ کبھی کبھی شراب پی لیا کرتا تھا۔ اس کو زندگی میں کچھ ایسی مایوسیاں ہوئی تھیں جن کو بھول جانے کے لیے اس کو اکثر "یک گونہ بیخودی" کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی سنگت کا اثر کہیئے یا خود اپنی نحوست کچھ دن میں مجھے بھی یہ لت لگ گئی اور اب ہم جب سینما جاتے تو "ساغر و مینا" کا شغل ضرور رہتا۔

ایک دن رتن میرے پاس آیا اور کہنے لگا "منظہر چلو آج سینما دیکھ آئیں تماشہ اچھا ہے اور نہ بھی اچھا ہوتا تو آج میں ضرور جاتا میں آج پریشان نہ جانے کیوں معمول سے زیادہ ہوں کچھ خفقان سا ہو رہا ہے

صبح سے میں بھی بے انتہا مضمحل تھا۔ اس لیے فوراً سینما کے لیے تیار ہو گیا درمیان تماشہ میں دس منٹ کا وقفہ ہوتا ہے، ہم لوگ حسب دستور "رسٹوراں" میں پہونچے۔

برسات کا موسم تھا، ہوا رکی ہوئی تھی، ہر شخص لیمنڈ اور برف سے حلق ٹھنڈا کر رہا تھا اور ہم "وھسکی" کے پیمانے خالی کرتے ہوئے ورڈسورتھ اور کیٹس کی شاعری پر بحث کر رہے تھے، اسی سلسلہ میں میں نے میر کا ذکر چھیڑ دیا، رتن تڑپ گیا۔ کہنے لگا "میر کا نام نہ لو، اس کمبخت کو محبت کے راز پر عبور حاصل ہے اور وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہے اور یہ بات اس کو مٹ کر نصیب ہوئی" میں جب اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسے اشعار کہنے کے بعد زندہ کیونکر رہتا تھا آہ! ؎

نامُرادانہ زیست کرتا تھا
میر کی وضع یاد ہے، ہم کو

رتن کی کافر ماجرا آنکھوں میں نمی آگئی۔ میرا بے طرح جی چاہتا تھا کہ اس کو لپٹا کر خوب پیار کر دوں، لیکن میری نگاہیں اس وقت ایک مقناطیسی کشش سے دوسری طرف متوجہ ہو گئیں ایک دوشیزہ ایک سولہ سترہ برس کے لڑکے کے ساتھ رسٹوراں میں داخل ہوئی اور

لیمنیڈ اور برف طلب کیا میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، یہ بلا شک شبہہ وہی "کافوری مورت" تھی جو خواب میں مجھکو بر باد کر چکی تھی، وہ مجھ سے بہت قریب تھی اور لیمنیڈ کا گلاس منھ سے لگائے ہوئے مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ رتن نے مجھکو مبہوت دیکھکر کہا "تم تو اس کو اچھی طرح جانتے ہو گے؟" میں؟ نہیں تو۔ میں اسکو بالکل نہیں جانتا" میں نے بدقت جواب دیا۔

"خوب! یہ تو یہاں کی بہت مشہور لڑکیوں میں سے ہے میری چھوٹی بہن لیلا کے ساتھ ایف اے کے پہلے سال میں پڑھتی ہے انگریزی اردو اور فارسی شاعری کی دلدادہ ہے، ادبی مذاق بہت بلند ہے، یہاں کے ایک باوقار اور مہذب خاندان کی لڑکی ہے لیکن اس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نذیر صاحب کی منظور نظر ہے۔ اس لیے مجھکو خیال ہوا کہ تم ضرور جانتے ہوگے، یہ تو نذیر صاحب کے مکان پر اکثر جایا کرتی ہے۔ ہم لوگ یہ امید لگائے ہوئے ہیں کہ پروفیسر صاحب بہت جلد اس سے شادی کر لیں گے"

اب مجھکو یاد آیا کہ نذیر بھائی کے متعلق وطن میں بھی عام طور پر مشہور تھا کہ ان کو کسی انگریزی تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ لگاؤ ہے اور وہ اہل خاندان کے خلاف اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے

رتن سے پوچھا "اس کا نام کیا ہے اور یہ اس کے ساتھ کون ہے؟"

رتن نے جواب دیا "اس کا نام سلطانہ ہے اور یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے جو انٹرنس میں پڑھتا ہے۔"

سینما سے رخصت ہوتے وقت رتن نے ہنسکر پوچھا "کیوں جی کہیں مس سلطانہ پر ریجھ تو نہیں گئے؟ تمھاری نگاہیں اور تمھاری بے بس صورت اس وقت تم کو بُری طرح رسوا کر رہی تھیں۔"

میں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "رتن لغو باتیں نہ کرو۔" لیکن میرا دل ہی جانتا تھا کہ وہ باتیں کہاں تک لغو تھیں۔ رتن کی بدگمانی کو میں اپنے جواب سے دور نہ کر سکا۔

رات کے تین بج چکے ہیں دماغ میں خشکی پیدا ہو چلی ہے۔ سر بھاری ہے ہاتھ پاؤں برف ہو رہے ہیں اب مجھکو چارپائی پر جانا چاہیئے آج میں بہت دیر میں لکھنے بیٹھا اس لیے زیادہ نہ لکھ سکا۔ اب بہ شرط خیریت کل۔

۹ر فروری

آج میں پہلے ہی سے ارادہ کر کے بیٹھا ہوں کہ رات بھر

لکھوں گا۔ ہاں :-

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

رت بھی ولولہ خیز ہے، ہلکی اور مسکن سردی جو بسنت کی تمہید ہوتی ہے میرے لیے ہمیشہ کیف آگیں ثابت ہوئی اور ایسے موسم میں میں کبھی بے اعتدالیوں سے نہیں ڈرتا چاہے بعد کو عرصہ تک کتنا ہی خمیازہ کھینچنا پڑے۔ بہرحال آج شاید اسی بہانہ سے کچھ زیادہ کام کرسکوں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ روشن آرا سے چھوٹ کر میں نے خود کو علم و ادب کی دنیا میں کھو دیا، وسعت مطالعہ نے بہت جلد خود میرے اندر انشا پردازی کا شوق پیدا کر دیا جس کی صلاحیت غالباً میرے اندر خلقی تھی۔ میں اپنی فرصت کے اوقات بیشتر شعر گوئی اور مضمون نگاری میں صرف کرنے لگا اور مجھے لوگوں سے اپنے کو شاعر اور ادیب منوا لینے میں زیادہ مدت نہیں لگی۔ الہ آباد میں رتن کی رفاقت نے میرے ساتھ وہی کیا جو اس سے کچھ دن پہلے روشن آرا کی صحبت کر چکی تھی، رتن خود تو شعر بہت کم کہتا تھا مگر وہ سخن سنج بلا کا تھا اس نے میرے ادبی ذوق و انہماک کو پر لگا دیئے۔

رتن عورتوں سے گریز کرتا تھا۔ اس کو عورت سے تلخ تجربہ ہوا ہوا تھا۔ وہ اپنی محبت میں مایوس و محروم رہ چکا تھا اور اب اپنی بہتری کے لیے عورتوں سے دور رہنا ضروری سمجھتا تھا۔

الٰہ آباد کی نہ جانے کتنی کنواری اور بیاہی تعلیم یافتہ عورتیں اس کے لیے اپنے اندر ”زلیخائی خروش“ لیے بیٹھی تھیں۔ مگر وہ ان سے بھاگتا ہی رہا۔

مجھے الٰہ آباد آئے ہوئے صرف چار مہینے ہوئے تھے اِس عرصہ میں میں نے سلطانہ کو دو بار دیکھا تھا۔ ایک بار تو وہی سینما میں اور دوسری بار الفریڈ پارک میں۔ اِس دفعہ بھی رتن میرے ساتھ تھا۔ اِتنی مدت میں میں نے اس کو ایک بار بھی نذیر بھائی کے وہاں نہیں دیکھا۔ اس پر مجھے حیرت تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چونکہ ان دنوں نذیر بھائی اور اس کے والدین کے درمیان شادی کے بارے میں زور شور کے ساتھ مراسلت ہو رہی تھی۔ اِس لیے نذیر بھائی کے پاس آنا جانا ”آئین دلیری“ کے خلاف تھا۔

سلطانہ نے میرے اندر ایک ہیجان تمنا پیدا کر رکھا تھا اِس میں شک نہیں کہ روشن آرا کی یاد رہ رہ کر مجھے اس کی طرف سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ میرے اندر یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ روشن آرا کا نعم البدل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ سلطانہ ہے اور میری پہلی محبت کے داغ کو اگر کوئی دل سے مٹا سکتا ہے تو وہ سلطانہ ہے۔ میں سلطانہ کی طرف کھنچا جا رہا تھا اور اگرچہ اس خواب کو یاد کر کے میرے رونگٹے تھرا جاتے تھے پھر بھی میں اِس حسین

ملا کو گلے لگانے کا آرزومند تھا۔ لاکھ کوشش کرتا تھا مگر اس کے خیال کو کسی طرح دل سے دور نہ کر پاتا تھا وہ میرے "خواب کی ملکہ" بنی ہوئی تھی۔ رتن غالباً میری اِس حالت سے بے خبر تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جاڑے کا زمانہ تھا۔ بڑے دن کی چھٹیاں ہونے والی تھیں کالج بند ہونے سے چند روز پہلے تقسیم انعامات کے لیے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مشاعرے اور مباحثے ہوئے اور ایک ڈراما کھیلا گیا۔ مباحثہ کا موضوع " زندگی میں شاعری کی اہمیت" تھا جس سے مجھکو اور رتن دونوں کو خاص موانست تھی۔ ہم نے مشاعرے اور مباحثے دونوں میں حصے لیے اور یہ کہنا خود ستائی نہیں ہوگی کہ دونوں جگہ ہم ممتاز رہے۔ رتن تو الہ آباد والوں کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ اس کی تقریر ہمیشہ دھوم مچا دیتی تھی لیکن اس کو رتن کی صحبت کا فیض سمجھیئے یا میری اپنی طبیعت کا اُبھار کہ اس دن میری تقریر پر مجھے بڑی داد ملی۔

رتن کو حسب معمول اوّل اِنعام ملا اور مجھکو دوم۔ مشاعرے کا اوّل اِنعام میں نے پایا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں رتن کے مکان پر پہونچا۔ دور سے دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ رتن میری طرف منھ کیے ہو

دھوپ میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے کرسی پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں جن کے ساتھ رتن نہایت جوش و خروش کے ساتھ کچھ بحث کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک عورت کو تو میں نے سمجھ لیا کہ لیلا ہوگی مگر دوسری عورت کون ہے؟ جب میں بالکل قریب آگیا تو رتن نے مجھکو دیکھ لیا اور یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا "تمھاری عمر بہت بڑی ہے۔ یہ تمھارا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا" دونوں عورتوں نے مجھے مڑکر دیکھا۔ ایک تو لیلا تھی اور دوسری؟ میری گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے سلطانہ کی نگاہیں اپنے اوپر جمی ہوئی پائیں۔

رتن نے میری گھبراہٹ کو محسوس کر لیا اور مجھے کرسی پر بٹھا کر سلطانہ سے کہنے لگا "مس سلطانہ اس کی ضرورت تو معلوم نہیں ہوتی کہ میں انسے آپ کا تعارف کراؤں اس لیے کہ آپ جیسا کہ ابھی کہہ رہی تھیں ان کو کئی بار دیکھ چکی ہیں اور ان کے نام سے واقف ہو چکی ہیں۔ ہاں اتنا اور سن لیجئے کہ یہ مسٹر نذیر کے چچا زاد بھائی ہیں اور میرے دلی دوست، یہ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں شاید آپ کو معلوم نہ ہو جہاں تک علمی اور ادبی اکتسابات کا تعلق ہے میں جلدی کسی کی فوقیت تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن انھوں نے اپنی فوقیت مجھ جیسے کافر سے تسلیم کرا لی۔ اس کے علاوہ مجھے ان کے ساتھ جو اتنا اُنس ہے وہ اس لیے

ہے کہ میری طرح یہ بھی دردمند دل رکھنے والے اور تباہی کو لبیک کہنے والے ہیں۔" رتن نے یہ کہکر میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

میرے اندر سلطانہ کو دیکھکر جو تلاطم پیدا ہوگیا تھا اس کو فرو کرنے میں رتن نے میری بڑی مدد کی۔ اس نے فوراً مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ کل تم نے جو دورانِ تقریر میں غزل گوئی کو اور اصناف شاعری کے مقابلہ میں اتنا بڑھا چڑھا دیا تھا اسی پر بحث ہوتے ہوتے اردو شاعروں پر بحث ہونے لگی اور پھر قائم چاند پوری کا تذکرہ چھڑ گیا۔ مجھکو تو قایم کا مرتبۂ شاعری تم سے معلوم ہوا ورنہ سوا نام کے اور ان کے دو ایک اشعار کے اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ تمھارا بہت بڑا احسان مجھ پر ہوا ہے۔ تمھارا یہ خیال بہت درست ہے کہ میرؔ دردؔ اور ان کے ہمسروں کا کچھ ایسا زور شور ہوا کہ نہ جانے کتنے ایسے غزل کہنے والوں کے نام تک اب سننے میں نہیں آتے۔ جن کے غزلیات میں ایک نرالا انداز تغزل پایا جاتا ہے۔ لیکن مس سلطانہ کو میں قایم کی شان تغزل کا قائل نہیں کرسکا ہوں اس لیے کہ مجھے اس کے اشعار زیادہ یاد نہیں ذرا تم اس وقت میرا ساتھ دو۔"

میں نے کہا " اچھا سگریٹ پلاؤ " اس پر لیلا اور سلطانہ دونوں ہنس پڑیں۔

رتن نے ایک سگریٹ خود جلایا اور ایک مجھکو دیا۔

میں نے کہا "یوں تو میرا خیال یہ ہے کہ قائم نے اگر اور کچھ نہ کہا ہوتا تو ان کو متغزلین کی پہلی صف میں جگہ دیگر غیر فانی بنانے کے لیے یہ ایک شعر کافی تھا۔ ؎

بیدماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

اِس پر سلطانہ کے منھ سے بیساختہ "واہ!" نکل گئی۔ میں نے کہا لیکن قائم کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جن کو پڑھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کو محبت کے جذبات پر میر اور درد سے کم عبور حاصل نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ ان کو فلسفہ اور تصوف سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن جہانتک دکھتے ہوئے دل کا تعلق ہے قائم کسی سے کم نہیں ہیں۔"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "منظر صاحب مجھے آپ لوگوں کی رائے سے اختلاف نہیں۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ قائم کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا ہے اس لیے کوئی قطعی رائے نہیں دیسکتی۔"

میں نے کہا "ہاں قائم کا دیوان ملتا نہیں۔ کیونکہ وہ اب تک شایع نہیں ہوا ہے۔ میں نے ایک قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے اور بہتیرے اشعار اپنی بیاض پر نقل کرلیے ہیں۔ مگر ان سے برطرف ہوکر اگر صرف ان اشعار پر بھی اکتفا کیا جائے جو تذکروں میں ملتے ہیں تو بھی قائم کا مرتبہ

معلوم کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر یہ شعر سنیئے۔ ؎

"نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی جو روئے ہیں خوں جم رہا ہے آنکھوں میں"

جو شخص محبت کی ابتدا اور انتہا کا ذاتی تجربہ نہ رکھتا ہو اس کی زبان سے ایسا شعر نہیں نکل سکتا۔ یا مثلاً وہ شعر جس کو رتن اکثر پڑھا کرتے ہیں:۔

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو میاں
سُنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

مجھے حیرت ہے کہ اس شعر کے ہوتے ہوئے مومن کا یہ شعر مشہور و مقبول کیونکر ہو گیا۔ ؎

"ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے"

جہاں تک اثر و تاثر کا سوال ہے مومن کے شعر کو قائم کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔

میرا سگریٹ ختم ہو گیا تھا اور میں نے سلسلۂ گفتگو ختم کر دیا تھا۔ رتن نے اس سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے کہا: "ہاں تغزل نام ہے کیفیات قلب میں ذاتی انہماک کا۔ جہاں یہ نہیں وہاں تغزل نہیں"

سلطانہ نے سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا اور کہا۔

"مظہر صاحب لیجئے اور سگریٹ پیجئے، مگر قائم کے اور کچھ اشعار سنائیے۔"
اس وقت رتن کی مسکراہٹ بہت معنی خیز تھی۔ میں نے اپنے کو پھر گھبرانے کا موقع نہیں دیا اور سلسلہ شروع کر دیا۔

"بعض شاعر ہوتے ہیں جن کی شاعری ان کی شخصیت کا پورا مرقع ہوتی ہے۔ انگریزی میں کیٹس اور شیلی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ فارسی میں خسرو، نظیری اور حافظ ہیں اور اردو میں جہاں تک میری معلومات ہے میر اور درد کے علاوہ متقدمین میں خواجہ میر اثر، خواجہ حسن اللہ بیاں اور قائم ہیں جن کا کلام ان کی شخصیت کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے یہ خصوصیت خلوص جذبات کی دلیل ہوتی ہے۔ قائم کے اس شعر کو سنئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کی واقعی یہ حالت نہ ہو وہ اس کو اس موثر پیرایہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ؎

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہے فراغ کہاں
کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

اس کے بعد میں نے یہ اشعار سنائے۔ ؎

رحم قائم مجھے آتا ہے جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

یہ سچ کہ جھوٹ ہے دعوائے دوستی لیکن
کبھی ہمیں بھی تو اِک بار آزمانا تھا

خوش رہ اَے دل اگر تو شاد نہیں
یاس کی شادی پر اعتماد نہیں
یار اگر چاہتا ہے دے قائم
جان کچھ دِل سے تو زیاد نہیں

کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل
کہ ہنسے تھا وہ بے وفا بھی یونہی

کوئی ۱۱ بج گئے تھے مجھکو رتن کے ساتھ ایک دوسرے ہم جماعت کے وہاں جانا تھا۔ ہم لوگ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلطانہ کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہے یہ صحبت کچھ دیر ابھی قائم رہے۔ چلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا "کیوں منظر صاحب کیا آپ اپنی بیاض مجھے منگنی دے سکتے ہیں میں قائمؔ کے اشعار نقل کرنا چاہتی ہوں اور اس کے علاوہ اور شعرا کے وہ کلام بھی جو میری نظر سے نہیں گزرے

نقل کرلونگی۔"

"بسروچشم" میں نے جواب دیا اور رتن کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

اس دن شام کو میں نے اپنی "کشف" کی قوت کو پھر اپنے اوپر مسلط پایا۔ سہ پہر ہی سے میرا سر کچھ چکرا رہا تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی؛ درو دیوار کچھ متحرک سے نظر آرہے تھے۔ میرے سارے جسم میں ایک لرزش سی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ میری مستقبل بیں نگاہ پھر مجھے کوئی تماشہ دکھانیوالی ہے۔ میں آج سرشام اپنے کمرے میں گھس گیا اور بستر پر پڑ رہا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کمرے میں ایک دھندلکا سا پھیلتا معلوم ہوا حالانکہ میں برقی قمقمہ روشن کرکے لیٹا تھا۔ میں اپنی رگ رگ میں ایک ہیجان محسوس کرنے لگا اور پھر مجھ پر وہی ملہمانہ غنودگی طاری ہوگئی جس میں میں نے وہی منظر دیکھا جو الٰہ آباد آنے سے پہلے اپنے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ وہی نوجوان حسین ساحرہ، وہی اس کی مسحور کرنے والی دلربائیاں، وہی میں وہی میری بے بسی، وہی آغاز وہی انجام، وہی ہنگامۂ آرزو، وہی اس کا حشر، رویا کے ختم ہوتے ہوتے میری رگیں پھر کھنچنے لگیں اور میں ہوش میں آگیا اب مجھے یقین ہوگیا کہ میرے خواب وخیال کی ساحرہ ضرور سلطانہ ہی کا عکس ہے کیونکہ دونوں میں سرمو فرق نہ تھا۔ میں حیران اور دہشتناک تھا لیکن جب پھر ہوش وحواس کی حالت میں سلطانہ کو یاد کیا تو اپنی ساری "پیش بینی" کو زبردستی اپنا واہمہ

سمجھکر دل سے نکالدیا۔

میرے اندر محبت کی خلش پھر پیدا ہوگئی تھی۔ میرے دل میں سلطانہ سمائی جا رہی تھی اس دن کے بعد میں قصداً رتن کے گھر ایک ہفتہ تک نہیں گیا۔ رتن سے مجھے معلوم ہوتا رہا کہ سلطانہ لیلا سے ملنے کے بہانے روز رتن کے وہاں آتی تھی اور مجھے ضرور پوچھتی تھی۔ رتن طرح طرح کی چٹکیاں لیتا تھا اور میں چپ تھا۔ باوجود رتن کے اصرار کے میں نے اپنے کو رتن کے گھر جانے سے باز رکھا۔ میں اپنے اندر ایک معشوقانہ پندار محسوس کرنے لگا تھا۔

بڑے دن کی تعطیل کو صرف دو روز رہ گئے تھے، میں کوئی دو ہفتہ کے لیے وطن جانے والا تھا۔ اب تک میں سلطانہ سے کتراتا رہا۔ کچھ تو اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اور کچھ اس لیے کہ میں بچپن سے بڑا شرمیلا تھا اور عورتوں سے آنکھیں ملاکر باتیں کرتے ہوئے ایک سراسیمگی سی محسوس کرتا تھا۔ مگر مجھے اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ سلطانہ میرے دل میں گھر چکی تھی۔

ہاں تو دو دن میں کالج بند ہونے والا تھا۔ میں اپنے سفر کا نقشہ درست کر رہا تھا۔ نذیر صاحب میرے ساتھ وطن آنے والے تھے، میں کوئی تین بجے سہ پہر میں کالج سے واپس آیا۔ ملازم چائے لیکر آیا تو

اس نے مجھے ایک رقعہ دیا جو کوئی لڑکا لاکر اسے دے گیا تھا۔ میں نے اس کو کھولکر پڑھا تو وہ سلطانہ کا خط تھا لکھا تھا۔

"مظہر صاحب!

میں بلا کسی تمہید کے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتی ہوں ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ گزرا کہ مجھ سے آپ سے رتن صاحب کے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی بیاض مجھے دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ وعدہ وفا کرنا تو ایک طرف آپ اس دن سے نہ جانے کیا سوچ سمجھ کر اس کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مجھ سے کہیں اتفاقی ملاقات بھی نہ ہونے پائے۔ مجھے آپ سے خدا واسطے کا اُنس پیدا ہوگیا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ یہ اُنس بڑھ رہا ہے مجھے کھلم کھلا اتنا کہدینے میں مطلق عار نہیں۔ اس وقت زیادہ تفصیل کرنا نہیں چاہتی۔ میں برابر اس کی کوشش کرتی رہی کہ کہیں آپ کا سامنا ہو جائے مگر آپ کی "لن ترانی" غالب رہی۔ خیر۔

آپ غالباً پرسوں گھر جانے والے ہیں۔ یہ خط میں
اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ آپ کے پاس بھیج رہی
ہوں۔ آپ آج شام کو رتن صاحب کے وہاں مجھ سے
مل لیجئے۔ اور اپنی بیاض بھی لیتے آیئے ورنہ یقین
مانیے آج میں سارا شہر آپ کی جستجو میں چھانتی
پھروں گی اور کہیں نہ کہیں آپ سے ضرور ملونگی
تھوڑا لکھنا بہت سمجھنا۔ اگر میرا گستاخ لب و لہجہ آپ کو
ناگوار ہوا ہو تو معاف کر دیجئے گا میں مجبور تھی۔

آپ کی گنہگار

"سلطانہ"

خط پڑھکر میں دنگ رہ گیا۔ آخر یہ لڑکی میری زندگی میں کیا کرنیوالی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ سلطانہ میری بیگانہ وشی کو قائم نہ رہنے دیگی لیکن آخر اِس کا انجام کیا ہوگا۔ میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا تھا کہ اب کسی عورت سے محبت کی راہ و رسم بڑھاؤں۔ اَب میں ایک لاابالی منتشر الحال، منتشر المزاج آدمی تھا جو کبھی کسی کی راحت کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔

روشن آرا کی جدائی کے غم نے مجھکو بزدل اور بے حوصلہ بنا رکھا تھا محبت کا نام آتے ہی میں کانپ اٹھتا تھا۔ رتن کی صحبت نے محبت کی طرف سے مجھکو اور بھی متوحش بنا رکھا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ضرور تھی کہ سلطانہ کو مجھسے ایک غیر معمولی تعلق خاطر پیدا ہوگیا ہے۔

شام کو میں رتن کے مکان پر پہونچا۔ کمرے میں انگیٹھی کے کنارے رتن، لیلا اور سلطانہ کے ساتھ بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا، سلطانہ نے اس کو بتادیا تھا کہ میں آج اس کا بلایا ہوا آنے والا ہوں۔

میں پہونچا تو رتن نے ایک غیر معمولی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے، میں نے سلام کیا تو آپ فرماتے ہیں۔

قدِ او از پئے تسلیم خم شد
ہلالِ عید مشتاقاں علم شد

سلطانہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور میں نے کسی قدر طنز سے کہا "جیسے آپ ویسی آپ کی عید"

رتن نے کہا "مظہر مس سلطانہ کو تم سے شکایت ہے۔ یہ تم سے برابر ملنے کی مشتاق رہی ہیں اور تم ان سے پہلو بچاتے رہے ہو" میں نے رسماً عذر لنگ پیش کیا اور تھوڑی دیر تک کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ رتن

بہت جلد میری حالت کو سمجھ گیا اور کہنے لگا۔
"اچھا ٹھہر کچھ شعر سناؤ، تم تو شاعری کی کان ہو" سلطانہ آج غیر معمولی طور پر بیباک اور شوخ نظر آ رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھکر رتن سے کہا "رتن صاحب آج میں نے بیدل کا ایک شعر دیکھا۔ کہہ نہیں سکتی کتنا ذوق انگیز شعر ہے سنئے۔ ؎

"نگہ شوق جہاں ہنیش تغافل ذوق تسکینش
ادب مینائے تمکینش جنوں پیمانۂ شورش"

کہئے آپ نے بھی کبھی ایسی آنکھیں دیکھی ہیں؟" رتن اور سلطانہ دونوں کی نگاہیں میری طرف اُٹھ گئیں۔ میں شعر کی داد بھی نہ دے سکا اور بُری طرح خفیف رہا۔ میرے دونوں چاہنے والے مسکرا رہے تھے۔ رتن کو سلطانہ کی اس بیباکی پر حیرت بھی تھی آخر کار میں نے بھی اپنی ناگفتہ بہ حالت کو سنبھال کر کہا "لیکن مجھے وہ خطرناک آنکھیں بھی یاد ہیں جن کے متعلق شاعر کہہ گیا ہے۔ ؎

ولے دارم خراب از التفات چشم بیمارش
ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارش

آپ کا شعر محض شعر ہے میرا شعر واقعہ بھی ہو سکتا ہے" رتن نے کہا "ظالم بازی تیرے ہی ہاتھ رہی" سلطانہ کچھ شرما سی گئی اور میرا کلیجہ

ٹھنڈا ہوگیا اس نے اپنی حالت چھپانے کے لیے میرے ہاتھ میں جو کاپی تھی اس کی طرف اشارہ کرکے کہا" میرا خیال ہے کہ یہ وہی آپ کی بیاض ہے جس کو آپ نے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا" میں نے بیاض کو ہاتھ بڑھاکر اس کے حوالہ کر دیا۔

تھوڑی دیر تک مختلف ادبی مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی میں سات بج گئے اور میں رَتن کے مکان سے رخصت ہوکر گھر کی طرف چلا۔ سلطانہ کی یہ چھیڑ چھاڑ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے دل پر قابو نہیں رکھتی۔ مجھے یہ قرینہ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ مگر پھر یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے سلطانہ کو میرے ساتھ اتنی قلیل مدت میں ایسی محبت پیدا ہوگئی ہو کہ وہ ضبط نہ کرسکتی ہو اور جلد سے جلد مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتی ہو۔ چونکہ وہ جانتی تھی کہ رتن میرا ہمراز ہے اس لیے اس کے سامنے بھی اگر اس نے کوئی جھجک محسوس نہ کی تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں ایک سرور محسوس کرنے لگا۔ میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔

میں الفریڈ پارک سے ہوکر اپنی قیامگاہ کو جا رہا تھا آسمان بھر تارے چھٹکے ہوئے تھے اور زمین سے آسمان تک فضا میں ایک نشاط انگیز کیفیت تھی۔ مجھ پر سماں کا اثر ہوا۔ وسط باغ میں ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ سردی خاصی تھی۔ اس وقت میں "کارزین" سے

بیخبر چاند اور ستاروں کی دنیا میں محو تھا۔ اس عالم میں مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میرے پیچھے سے کسی نے یہ شعر پڑھا۔

"نہ لگے تجھکو نظر اے قدِ رعنا والے
بے طرح گھورتے ہیں عالمِ بالا والے"

میں نے مڑ کر دیکھا تو سلطانہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ رات کے دھندلکے میں اس کی بالکل وہی ہیئت تھی جو نیم خوابی کی حالت میں ہوا کرتی تھی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے کہا "گھبرائیے نہیں۔ آج قسمت سے آپ مجھے اس حال میں ملے ہیں۔ میں نہ جانے آپ سے کیا کیا کہنا چاہتی تھی۔ مگر آپ نے کبھی اس کا موقع نہیں دیا" یہ کہکر وہ میرے قریب بنچ پر بیٹھ گئی میرا دل دھڑکنے لگا۔

میں نے کہا "اب رات ہو رہی ہے اور سردی بڑھ رہی ہے کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے، یہ کھلے میدان میں بیٹھنے کا وقت نہیں۔ گھر چلنا چاہیئے" "یہ اس سے پہلے کیوں نہیں سوچا تھا؟" سلطانہ نے طنز کے ساتھ کہا۔

"مظہر صاحب اب جب تک میں اس جگہ ہوں آپ کو ٹھہرنا ہوگا۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ میں تو آپ سے قرب چاہتی ہوں اور آپ مجھ سے بھاگتے ہیں؟" سلطانہ کی صورت اس وقت مجھے زیادہ دلکش معلوم

ہو رہی تھی۔ میں نے کسی قدر محبت کے ساتھ پوچھا " آخر آپ کیوں مجھ سے ملنے کی آرزومند رہتی ہیں؟ ایک غمناک کی صحبت سے آپ کو غم کے سوا کیا مل سکتا ہے؟ میں تو دنیا کے ان منحوس لوگوں میں سے ہوں جن کی نحوست متعدی ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی لگ جاتی ہے۔ میں اسی لیے آپ سے دور ہی رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ میں جلد کسی کو اپنا دوست بنانا نہیں چاہتا۔ میں اپنے دوستوں کو سوا افسردگی اور سوگواری کے اور کچھ نہیں دے سکتا اور خاص کر عورتوں سے تو اور بھی الگ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کے ہاتھوں اور بھی خراب و برباد نہ ہو جاؤں۔ یا کہیں میں خود کسی عورت کو غارت نہ کر دوں اور میرا یہ شعر جو اب تک محض میرا تخیل ہے کہیں واقعہ نہ ثابت ہو۔

" مری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا
کہاں سے کنج میں پھولوں کے طرح آشیاں رکھ دی "

شعر سُنکر سلطانہ بے چین ہو گئی اور پوچھنے لگی " آپ ایسا دکھتا ہوا دل کہاں سے لائے۔ کس نے آپ کو اس قدر دنیا سے برداشتہ خاطر کر رکھا ہے؟ آپ کی یہی سب باتیں تو ہیں جو میرے دل میں گھر کیئے ہوئے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی اچانک لگاؤ نہیں پیدا ہوا۔ جب سے آپ یہاں آئے ہیں میں آپ کو ہر ادبی مجمع میں دیکھتی ہوں۔ آپ کے

مضامین جو وقتاً فوقتاً اِدھر اُدھر نکلتے رہتے ہیں پڑھتی ہوں۔ آپ کی تقریریں سنتی ہوں اور آپ کے ادبی نکات کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتی ہوں۔ عرصہ سے مجھے آپ سے ملنے کی تمنا تھی۔ اس دن اِتوار کو جو میں رتن صاحب کے وہاں گئی تھی تو یہ سمجھ کر گئی تھی کہ آپ وہاں ضرور آئیں گے اور میرا خیال صحیح ثابت ہوا لیکن اس کے بعد آپ مجھ سے رم کھاتے رہے اور میں آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ خیر۔ ہاں تو یہ بتایئے کہ آپ کیوں اس قدر بیزار اور بے حوصلہ رہتے ہیں؟

کس سوچ میں ہو نسیم۔ بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

اس کی نازک نسوانی آواز میں مجھکو ایک دردمندانہ خلوص محسوس ہوا۔ میں نے کہا اِس کا جواب ایک شاعر دیگیا ہے:۔

"دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا"

شعر پڑھ کر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ میری آنکھیں نم آلود ہوگئیں، بے طرح جی چاہتا تھا کہ وہاں سے اُٹھکر بھاگ جاؤں۔ لیکن سلطانہ کی شخصیت اس وقت مجھ پر حاوی تھی۔ اس نے پھر پوچھا "للہ سچ سچ بتا دیجئے آپ کس درد کے مارے ہوئے ہیں؟ آپ کو کیا ہوا ہے؟

کس نے آپ کو اس طرح خراب کر کے چھوڑ دیا ہے؟"

"کسی نے نہیں مس سلطانہ ...." میں اتنا کہنے پایا تھا کہ اس نے بات کاٹ کر کہا "بس اس کے بعد آپ مجھے سلطانہ کہیئے اور" آپ آپ" کہکر نہ مخاطب کیجئے سنا" "اچھا تو سلطانہ سنو" میں نے پھر شروع کیا "مجھے کسی نے نہیں خراب کیا ہے میں اپنی قسمت کا مارا ہوا ہوں"

کیا کہوں کس عذاب نے مارا
دلِ خانہ خراب نے مارا

اور اَب یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں میرے " دلِ خانہ خراب" کو عشق کا روگ بھی نہ لگ جائے اور پھر میں زندہ درگور ہو جاؤں"

سلطانہ نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا " تو کیا آپ محبت کو زندہ درگور ہونا سمجھتے ہیں؟ حیرت ہے آپ شاعر ہو کر ایسا سمجھتے ہیں۔ عشق تو نام ہے ایک سرمدی سرور کا۔ آپ کیٹس، میرؔ، دردؔ اور قائمؔ جیسے شاعروں کے پرستار ہو کر عشق سے ایسی بیگانگی کا اظہار کرتے ہیں یہ تو ایک معمہ ہے"

میں نے شرمندہ ہو کر جواب دیا " سلطانہ اصل قصہ یہ ہے کہ مجھکو عشق کا تجربہ ہو چکا ہے ممکن ہے تمہارا ہی خیال صحیح ہو۔ لیکن میرے

تجربے نے مجھکو کچھ اور سبق دیا ہے" میں نے اپنے کو مجبور پایا کہ اس سے اپنا اور روشن آرا کا قصہ بیان کر دوں۔ اس کے بعد میں نے کہا "سلطانہ!"

یہ دِل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دِل رہا ہے

سلطانہ نے اپنی تیز اور غائر نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا "تو اب تو اور بھی آپ مجھکو حسین و دلکش نظر آنے لگے ہیں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں کسی حیثیت سے روشن آرا کا مقابلہ کر سکتی ہوں یا اس سے زیادہ آپ کی محبت کی مستحق ہوں لیکن کم سے کم اب یہ کوشش تو ضرور کرونگی کہ روشن آرا سے چھوٹ کر جو کمی آپ اپنی زندگی میں پانے لگے ہیں اس کو میں پوری کر دوں اور مجھے اُمید ہے میں کامیاب ہونگی"

اسی گفت و شنید میں دس بج گئے۔ سلطانہ نے کہا "اچھا اب ہم اگر کچھ دیر اور یہاں بیٹھے رہے تو جم کر رہ جائیں گے۔ میرے لیے تو اس میں بھی ایک مزہ تھا مگر ہر شخص کا مذاق یکساں نہیں ہوتا اب میں آپ سے رخصت ہوتی ہوں لیکن اتنا سن لیجئے مجھے اس چار مہینہ کے اندر آپ سے جو لگاؤ پیدا ہو گیا ہے وہ بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ لگاؤ میرے لیے نت نئی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور آپ کو اتنا جان لینا چاہیے

کہ اگر آپ نے میرے جذبات کی پذیرائی نہ کی تو ممکن ہے اس کا انجام بُرا ہو۔"

میں نے کہا" سلطانہ تم نے آخر مجھے بھی مجبور کر دیا کہ میں اپنا پردہ فاش کر دوں۔ میں زیادہ طویل گفتگو کرنا نہیں چاہتا میں خود تمھاری محبت کی چوٹ دل میں لیے ہوئے ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ اب زندگی کے متعلق میرے کیا خیالات ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی تازہ مصیبت مول لینا نہیں چاہتا۔ اور پھر میں اپنے کو منحوس اور بدبخت سمجھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں میری نحوستوں کا اثر دوسروں پر نہ پڑے۔ تم اِس راہ میں ذرا سوچ سمجھکر قدم رکھو۔"

سلطانہ اچھل پڑی اور کہنے لگی "کیا سچ کہتے ہو۔ میں تو تم کو سنگدل سمجھنے لگی تھی۔ تو کیا واقعی تم بھی میرے ساتھ ایک تعلق خاطر رکھتے ہو۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔ تم نے میرے اندر زندگی کی ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی ہے۔ تم کو جاننے کے بعد میرے دل میں یہ خیال جم گیا ہے کہ اگر میرے مزاج اور میری فطرت کو کسی سے مناسبت ہوسکتی ہے تو وہ تم ہو۔ خیر یہ آنے والا وقت بتائے گا کہ اِس قلبی ارتباط، اس روحانی اِتحاد کا انجام کیا ہوگا۔ ابھی سے اس کے متعلق کچھ کہنا سننا یا کوئی فیصلہ کرنا بیکار ہے۔"

میں نے کہا" مگر چلتے چلتے ایک بار پھر سُن لو اور سمجھ لو کہ میرا روگی دِل

کسی قابل نہیں ہے اور کسی کے کام نہیں آسکتا۔ سلطانہ میرے دل کو تم نے دل سمجھ رکھا ہے مگر اس کو نہ بھولو کہ اب :-

"بجائے بادہ لہو ہے اِس آبگینے میں"

سلطانہ نے دیوانہ وار جواب دیا " ہاں ہاں مجھے معلوم ہے اور میں جانتی ہوں کہ مجھے لہو درکار ہے بادہ نہیں "

آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ سلطانہ محض وفورِ ہیجان میں اندھی ہو رہی ہے اور عمر بھر اندھی نہیں رہے گی۔ کاش میں اپنی " چشمِ غیب بیں " کی قدر و قیمت پہچانتا اور اس پر کچھ اعتماد کرتا مگر میں نے اس کو محض اپنا وسواس سمجھا۔ اس دن میں نے پھر اپنے کمرہ میں اپنے اوپر اسی " مقدر شناس " قوت کو مسلط پایا۔ میں پھر دیکھ رہا تھا کہ سلطانہ مجھے غارت کرنے کے درپے ہے۔ لیکن اب کی دفعہ میں نے اس کو اور بھی زیادہ وہم پر محمول کیا اور اپنے ارادہ اور عقل پر زور دے کر اس کی تردید کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کی بہت تھوڑی دیر تک مجھ پر یہ " عالمِ غیب " طاری رہا۔ اِس کے بعد عرصہ تک یہ قوت مجھ سے بیزار رہی۔

آج لکھتے لکھتے صبح کے پانچ بج گئے ہیں۔ رگ رگ میں تشنج پیدا ہو رہا ہے۔ دماغ خشک ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے ابھی تک مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مگر اب ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی دَورہ

نہ شروع ہو جائے۔ مجھے مرجانا منظور ہے مگر دورہ نہیں منظور۔

خیر اب ہاتھ منھ دھو کر اپنے حواس درست کروں گا اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر دن بھر سو کر کاٹ دینے کی کوشش کرونگا۔

۲۵ر فروری

آخر کار مجھ پر دورہ پڑ ہی گیا۔ مجھے یہ اندیشہ لگا ہوا تھا۔ میں اسی دن سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک کل ۵ بجے صبح تک کرسی پر بیٹھے لکھتے رہ جانا بے نتیجہ نہیں جائے گا۔ لیکن میں بھی بلا کا سخت جان ہوں۔ چار پانچ دن کے اندر نہ جانے کتنے دورے مجھ پر سے گزر گئے اور ہر دورہ ایک موت تھا۔ مگر مجھے نہ مرنا تھا نہ مرا۔ غالب کا شعر آپ لوگوں نے سنا ہوگا:۔

"مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اس شعر کی شرح کوئی مجھ سے پوچھے جو ایک طرف تو "مرنے کی آرزو" میں مر رہا ہے دوسری طرف حقیقی معنی میں بھی مر رہا ہے مگر کسی طرح مر نہیں چکتا۔ مثل مشہور ہے "جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے" لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کو رکھنا بھی منظور ہوا تو مجھ جیسے کو جو نہ دین کے کام کا

نہ دنیا کے۔ اور اگر رکھنا ہی منظور تھا تو اس بار بار "موتوا قبل اَنْ تموتوا" کے کیا معنی؟ مگر یہ تو خدا کی مصلحت ہے اور اس کی قدرت چاہے مارے چاہے جلائے، نہ چون و چرا کی گنجائش، نہ معتا بلہ کی تاب۔

آج ۱۵ار ۱۶ار دن کے بعد پھر اس قابل ہوا ہوں کہ قلم ہاتھ میں لوں ابھی کل تک تو ڈاکٹر کی سخت ممانعت تھی کہ چارپائی سے جنبش نہ کروں اور اکدم آرام کروں جب ڈاکٹروں سے اور کچھ بن نہیں آتی تو وہ اپنے مریضوں کو اسی طرح کے لٹکے بتا دیتے ہیں جن سے مریضوں کا بہت جلد دم ناک میں آجائے خیر میں بھی کل تک ان کے کہنے پر عمل کرتا رہا اور چارپائی سے کہیں حرکت نہیں کی۔ مگر آج اُٹھ بیٹھا اور ڈاکٹر کے مشورہ کا انتظار نہیں کیا۔ کون جانتا ہے کب میری زندگی کی میعاد پوری ہو جائے۔ اور میں اپنی اِس بے سروپا داستان کو ادھوری چھوڑ کر چل بسوں۔ اس لیے " اِتنی فرصت بہت غنیمت ہے" اور اس کو کام میں لانا چاہیئے۔

ہاں تو بڑے دن کی تعطیل میں میں اپنے گھر آیا تو میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ میں اب یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنی گزشتہ اور آئندہ زندگی پر غور کر رہا تھا۔ مجھے روشن آرا پھر یاد آ رہی تھی اور بے طرح یاد آ رہی تھی۔ الہ آباد میں کچھ تو

اپنی ادبی شورشوں میں اور کچھ سلطانہ کی تازہ اثر آفرینیوں میں روشن آرا کو بھولا ہوا تھا۔ کم سے کم میں یہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن لکشمی پور میں کچھ تو عہد ماضی کے اختلافات اور کچھ سلطانہ کی نئی دعوت رومان و محبت کے خیال نے پھر روشن آرا کی یاد تازہ کر دی اور اب جو میں نے اپنے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دراصل روشن آرا کی یاد کبھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی تھی اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ میری زندگی میں یہ روشن آرا ہی کی کمی ہے جس کو میں بغیر پوری کیے ہوئے نہیں رہ سکتا اور جس کو اب سلطانہ سے پوری کرنا چاہتا ہوں۔ لکشمی پور پہونچنے کے دوسرے ہی دن رات کے وقت میں نے احمد جام کی مشہور غزل پر فارسی میں ایک غزل کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔ ان سے میرے جذبات کی ترکیب کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ؎

ہر جا کہ روید سنبلے پیچد مرا موے کسے
ہر جا کہ بینم لالۂ یاد آورم روئے کسے

با کفر ایماں باختم با آذری پرداختم
من قبلۂ خود ساختم محراب ابروئے کسے

اے کفر اے ایمانِ من اے ظاہر و پنہانِ من
اے ولے گر ایجانِ من بینم دگر سوئے کسے

اور مجھکو یقین ہے کہ ان اشعار میں میرا روئے سخن روشن آرا کی طرف تھا۔ اور میں آج تک یہی سمجھے ہوئے ہوں کہ سلطانہ کے بہانہ سے میں روشن آرا ہی کی محبت کا حق ادا کر رہا تھا۔ غرضکہ تعطیل میں سلطانہ کی قدر میرے دل میں اور بڑھ گئی اور میں نے فوراً اپنے خیالات کو ایک خط میں سلطانہ سے بیان کر دیا۔ سلطانہ نے اس کے جواب میں جو خط بھیجا اس نے اور بھی میرے دل کو موہ لیا۔

پیارے مظہر

تمھاری تحریر ملی۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا اور ہر بار مجھکو اس میں تازہ کیفیت محسوس ہوئی تم شعر کہو یا نہ کہو تمھارے اشعار تنقید کی رو سے معیار شاعری پر پورے اتریں یا نہ اتریں۔ میں تم کو شاعر مانتی ہوں۔ ایسا شاعر جس کا رتبہ صوفی اور نبی سے بڑا ہوتا ہے۔ آسکر وائلڈ نے حضرت عیسیٰ کو ایک شاعر بتایا ہے اور اس پر بڑا زور دیا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰ کو ردیف و قافیہ سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ لیکن آسکر وائلڈ کو

اصرار ہے کہ حضرت عیسیٰ شاعر پہلے تھے اور پیغمبر بعد کو، اور اس سے حضرت عیسیٰ کی قدر و منزلت اس کی نظر میں بڑھ گئی ہے۔ میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ شاعر پیغمبر سے زیادہ برگزیدہ اور قابل قدر ہستی ہوتا ہے۔ اور میں نے تم کو موہو شاعر پایا۔ اسی نے مجھے تمھارا اس طرح گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اور اتنی قلیل مدت میں۔ ہاں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تم کو اس سے پہلے کسی روشن آرا سے بھی تعلق خاطر رہ چکا ہے اور مجھکو جو جگہ تمھارے دل میں ملی وہ صرف اس مقدس روشن آرا کی کمی پوری کرنے کے لیے ملی ہے میں تم کو اسی طرح چاہتی رہوں اور چاہوں گی مجھکو یہ منظور ہے کہ تم روشن آرا کی متبرک یاد کو مجھ پر فوقیت دئے رہو۔ تمھاری نئی فارسی غزل بالخصوص اس کا پہلا شعر تمھاری تشریح و تحشیہ کے بعد میرے لیے ایک الہام ہے اس نے محبت کا ایک جدید نظریہ مجھ پر روشن

کیا ہے۔ کیوں مظہر اپنی شاعری اور اپنی شعریت سے مجھکو کہاں تک خراب کروگے؟ کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ اب ایک دفعہ تمھارا نام لیکر اپنا دم توڑ دوں؟ مجھکو تو کوئی اور صورت ایسی نظر نہیں آتی کہ تمھاری ساحری کا پورا پورا حق ادا کرسکوں۔ اس طرف بڑے انہماک اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی آئندہ زندگی کے خیالی اہتمام میں لگی رہی ہوں اور تمھارے ساتھ مجھکو جو والہانہ تعلق پیدا ہوگیا ہے اس پر غور کرتی رہی ہوں اب مجھکو اپنی بہبود صرف اس میں نظر آرہی ہے کہ کسی طرح تم میری زندگی کے مستقل اور لازمی جزو بن جاؤ اس تھوڑے سے عرصہ میں میرے اندر جو انقلاب پیدا ہوگیا ہے اور تمھاری ملاقات نے مجھے جس منزل پر پہونچا دیا ہے اس پر تم جتنی حیرت کرو کم ہے اس لیے کہ میں خود حیرت میں ہوں اور اگر میں یہ سوال کروں کہ "ظالم وہ تیری نگاہ کیا تھی؟" تو مجھے اس کا حق حاصل ہے

مجھے اصرار ہے اور تم کو اس سے انکار نہیں
ہو سکتا کہ تم نے بات کی بات میں مجھے اس
راہ سے اگر بھٹکایا نہیں تو الگ ضرور کر دیا جس پر
ایک مدت سے اطمینان اور سلامت روی کے
ساتھ چلی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بات کھٹک رہی ہے
اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے تم کو بھی یہ بات
کھٹک رہی ہوگی۔ ڈرتی ہوں تم مجھے غیر مستقل
مزاج، وفا ناشناس اور بے اعتبار نہ سمجھ
رہے ہو۔ میں یہ مانتی ہوں کہ میرے اور نذیر
صاحب کے تعلقات دیرینہ ہیں اور یہ بھی مانتی
ہوں کہ اگر درمیان میں تم نہ آ گئے ہوتے تو
زیادہ امکان اسی کا تھا کہ میری شادی نذیر
صاحب ہی کے ساتھ ہوتی۔ اب تک میرے
والدین اور اپنے پرائے یہی سمجھ رہے ہیں اسلیئے
کہ میں نے ابھی بظاہر کوئی نیا پہلو نہیں بدلا ہے
اور اپنے دل کے بھید سے کسی کو آگاہ نہیں
کیا ہے۔ لیکن عنقریب بغیر تم سے مشورہ کئے ہوئے

اور بغیر تمہاری اجازت لیے ہوئے ایسا کرنیوالی ہوں۔ نذیر صاحب سے میری نسبت کے ذمہ دار میرے والدین اور خود نذیر صاحب تھے اِس میں میرے اِرادہ یا میرے اپنے جذبات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے کسی سے اِختلاف نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک خود میرے اندر کوئی اپنا جذباتی اُبھار نہیں پیدا ہوا تھا لیکن یقین مانو کہ روزِ اول سے میں نے اپنے اور نذیر صاحب کے درمیان کوئی نسبت یا کوئی طبعی ارتباط محسوس نہیں کیا، کہاں میری شعریت اور رومانیت سے لبریز فطرت! کہاں نذیر صاحب کی ٹھوس ریاضیاتی طبیعت، کہاں ان کا واقعیت، سطحیت اور اِفادیت کا اِعلان کرنے والا قیافہ۔ کہاں میری یہ صورت جو صرف جمالیاتی میلانات سے معمور نظر آتی ہے غرضکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی مشترک عنصر نہیں پایا جاتا۔ ظاہری صورت بھی ایسی نہیں

جس پر ان محاسن باطنی کو قربان کر دیا جائے۔ اگر ان سے میری شادی ہو جاتی تو میں اس رشتہ کو محض ایک خشک اور بے کیف دنیا دارانہ معاملہ سمجھتی۔ اب میں یہ معاملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں چاہے اس میں ساری دنیا مجھ سے برگشتہ ہو جائے۔ چاہے اب اس کے بعد تم میری دعوت قبول کرو یا نہ کرو۔ تم نے مجھے خود اپنے فطری میلانات سے خبردار کر دیا اور میں ان کی طرف سے بے حسی اور بے اعتنائی نہیں برت سکتی اگر مجھکو تم نہیں ملوگے تو پھر تم جیسے کی تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھان ڈالونگی اگرچہ تم جیسا دوسرا ملنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مگر ابھی سے ان وسوسوں کو اپنے دل میں کیوں راہ دے رہی ہوں؟ یہ ممکن نہیں کہ میری محبت کی تاثیر سے تم بیگانہ رہو اور میرے ارمانوں کا خون کردو۔ مجھے تمہاری فطرت شعری سے زیادہ اپنی دھن اور اپنے

زور طبیعت پر اعتماد ہے، یہ ممکن نہیں کہ میں تمہارا
تعاقب کروں اور تم مجھ سے دامن بچا کر نکل جاؤ۔

" نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے
جو نکلا جذب دل کامل ہمارا"

تم کو معلوم ہوگا کہ یہ مولانا آسی کا شعر ہے۔
وہ آسی جن کے تصوف میں بقول تمہارے تغزل
اور تغزل میں تصوف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے
مجھے بیساختہ اسی غزل کا ایک اور شعر یاد آرہا ہے
جس کی رسائی اور بلاغت کی داد دینے کے لیے
منظر کے تخیل کی ضرورت ہے۔ میں اس میں
کھو کر رہ جاتی ہوں۔

دل گردوں سے بیسکرتا دل دوست
گیا نالہ کئی منزل ہمارا

اس وقت ان تمام منزلوں کو آنکھوں کے
سامنے لانا چاہتی ہوں جو " دل گردوں سے

لے کر "دل دوست" یا مظہر کے دل تک حائل ہیں تو میرا سر چکرانے لگتا ہے اور میں کسی طرح ان منزلوں پر احاطہ نہیں کر پاتی۔ تم آؤ اور میری مدد کرو۔

میں نے آج اپنے کو اچھی طرح تمہارے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔ اب کوئی حجاب باقی نہیں ہے۔ کم سے کم مجھے تو نہیں ہے میں اتنا جلد اس طرح بے نقاب کیوں ہو گئی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار اپنی طبیعت کا صحیح حال معلوم کر لینے کے بعد میں زیادہ عرصہ تک تذبذب اور انتشار میں نہیں پڑی رہ سکتی تھی۔ یہ میری فطرت ہے۔ اب میرے مستقبل کا دارومدار تم پر ہے۔

تمہاری پرستار

"سلطانہ"

آخر سلطانہ کیا کرنے والی ہے؟ کیا وہ میرے چلتے دنیا کی قیامت

سر پر اٹھانے والی ہے؟ سلطانہ سے کوئی بعید نہیں۔ وہ ارادہ کی قوی اور دھن کی پکّی عورت ہے۔ اتنا تو میں بہت جلد سمجھ گیا تھا۔ اس نے بہت صحیح اندازہ کر کے یہ کہا تھا، "یہ ممکن نہیں کہ میں تمھارا تعاقب کروں اور تم مجھ سے دامن بچا کر نکل جاؤ۔" ہاں کم سے کم میں اپنے اندر ایسی تاب نہیں پاتا تھا۔ سب سے زیادہ میں نذیر بھائی سے شرمندہ تھا۔ میں ان کو کیا منھ دکھاؤں گا؟ لیکن یہ تو دل اور دل کا معاملہ ہے اس میں دنیا کے تعلقات اور ان کا پاس کیا معنی؟ سلطانہ میری طرف مائل ہے۔ میں سلطانہ کی طرف۔ چلو سارا قصہ ختم ہوگیا۔ اس میں کسی تیسرے شخص کا لحاظ کیسا؟ مجھ پر بھی سلطانہ کا خط پڑھکر سلطانہ کا جن سوار ہوگیا تھا اور اب میں دنیا میں کسی بات کا لحاظ کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور نہ اس کو گوارا کر سکتا تھا کہ دنیا کی کوئی رسمی بات میرے اور سلطانہ کے درمیان آکر حائل ہو۔ میں نے سلطانہ کو جو مختصر اور مبہم خط لکھا وہ یہ تھا:۔

"سلطانہ

تمھارے محبت نامہ کے جواب میں مجھے
بھی مولانا آسی کی اسی غزل کا مطلع یاد آگیا اور
فی الحال میں اسی پر قناعت کرتا ہوں۔

پسند آئے تو لے لو دل ہمارا
مگر پھر دل بھی کس قابل ہمارا
میں آخر وقت تک تم کو متنبہ کرتا جاؤں گا۔

تمہارا

مظہرؔ

لیکن سلطانہ کے عزم محبت نے میرے اندر بھی ایک قوی اور قطعی عزم پیدا کر دیا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ میری ماں نے اس درمیان میں بڑے ارمانوں کے ساتھ فیض آباد میں میری جو نسبت لگائی تھی اس سے میں نے کھلم کھلا انکار کر دیا میری ماں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے مجھکو بہت سمجھایا مگر میرا فیصلہ اٹل تھا۔

میں نے کہا " اماں میں اِس حماقت کے لیے تیار نہیں۔ ابھی نہ میری شادی کا وقت آیا ہے نہ میں شادی کرونگا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں ابھی سے عہد کرکے اپنے کو مجبور اور پابند کرلوں۔ جب وقت آئے گا تو نسبت بھی ہوجائے گی اور شادی بھی۔ تم بیکار ابھی سے یہ سودا مول نہ لو" میری ماں چپ ہوگئی مگر اس کا ملال باقی رہا۔

آج اتنے دنوں کے بعد لکھنے کی نیت سے بیٹھا تھا مگر آج کچھ نہ ہو سکا۔

ابھی میری نقاہت بدستور باقی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ آج اتنا لکھنے کے بعد ہوا۔ اَب نہ مجھ سے بیٹھا جاتا اور نہ میرے ہاتھ سے قلم سنبھلتا ہے مجبوراً پھر جاکر اسی چارپائی پر لیٹ رہتا ہوں۔ جو شاید میرے لیے موت کا گھاٹ ثابت ہونے والی ہے۔

۲۷ر فروری

زندگی بھی عجیب چیز ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری زندگی سرتا سر مصیبت ہے جینے کی ہوس دل میں بدستور باقی ہے۔ اس کا یقین رکھتے ہوئے بھی کہ مجھے مرنا ہے اور بہت جلد مرنا ہے میں مرنے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کل میں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ صرف از روئے اِحتیاط تھا۔ ورنہ کل میں بھلا چنگا تھا۔ آہ!

"جینا ہے کہ قید بے قفس ہے یا رب!"

مگر یہ تو شاید دائرۂ موضوع سے خارج بات تھی۔ مجھے جلد سے جلد اور مختصر سے مختصر الفاظ میں اپنی سرگزشت کو ختم کر دینا ہے۔ سلطانہ نے واقعی سال بھر کے اندر سارے الہ آباد میں ایک شور مچا دیا۔ جو سلطانہ بہت تھوڑے عرصہ میں پروفیسر نذیر سے بیاہی جانیوالی تھی اس کے

متعلق اَب ہر شخص جان گیا تھا کہ اس کو اس رشتہ سے شدید اِختلاف ہے اور وہ نذیر کی بیوی بننا کسی طرح پسند نہیں کرتی۔ سلطانہ کے ماں باپ نے کچھ تو اس لیے کہ وہ نذیر بھائی کو بیٹی کے لیے بہترین شوہر سمجھتے تھے۔ اور کچھ اِس لیے کہ اب ان کو اپنی زبان کی لاج تھی سلطانہ کو بہت سمجھایا بجھایا۔ مگر سلطانہ نے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی۔ سب نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ دھمکیاں دیں۔ شرم دلائی۔ مگر سلطانہ تھی کہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ قایم رہی۔ ماں باپ کو جب اس نے غیر معمولی طور پر رنجیدہ اور کبیدہ خاطر دیکھا تو کہا: "دیکھیئے یہ میری زندگی بھر کا معاملہ ہے اور اس میں میری اپنی پسند اور میری اپنی رائے سب پر مقدم ہے اس میں آپ لوگ زبردستی نہ کیجیئے۔ ممکن ہے آپ ہی لوگ بعد کو پچھتائیں اور ہاتھ ملیں۔ میں نے جو آپ کی رائے سے اِختلاف کیا ہے تو بہت دور تک کی باتوں کو سوچ سمجھکر اختلاف کیا ہے آپ لوگوں کو میری شادی کرکے مجھکو شاد و بامراد دیکھنے کا حق ہے نہ کہ میرا گلا گھونٹنے کا۔ آخرکار سب تھک کر خاموش ہو رہے۔ اگر آج سلطانہ کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی یا اس کے ماں باپ کی جگہ دوسرے ماں باپ ہوتے تو سلطانہ کی یہ جرارت نہ ہوتی کہ وہ بیباکی اور خودسری کے ساتھ اختلاف کرتی اور اِختلاف میں یوں جیت جاتی۔ لیکن سلطانہ گھر کی لاڈلی اور نازپروردہ تھی۔ ماں باپ کو اس اِختلاف

اور بد عہدی سے تکلیف ضرور ہوئی لیکن پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ سلطانہ کا دل ٹوٹ جائے۔ بالآخر بول بالا سلطانہ ہی کا رہا۔

میں البتہ پانی پانی ہو رہا تھا۔ نذیر بھائی کے سامنے آنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی میرے جاننے والوں میں سے اکثر اور غالباً نذیر بھائی بھی سلطانہ کا بہکانے والا مجھی کو سمجھ رہے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سلطانہ مجھ سے روز ملا کرتی تھی اور یہ احتیاط کبھی نہیں کرتی تھی کہ اس کے حرکات وسکنات سے یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ اس کو میرے ساتھ کوئی خاص تعلق خاطر ہے۔ بلکہ اُلٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاہتی کہ ہر شخص جلد سے جلد جان لے کہ اس کو میرے ساتھ کسی قسم کا لگاؤ ہے۔ اس نے اور بھی سب مجھے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ ہر مجلس اور ہر صحبت میں میرے ساتھ اپنی بڑھی ہوئی گرویدگی کا اظہار کر بیٹھتی اور میں خفیف ہو کر رہ جاتا ایک دن جبکہ وہ جولائی کی ایک شام کو میرے ساتھ خسرو باغ کے ایک دور اُفتادہ گوشہ میں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی محبت کے ولولوں کا اظہار کر رہی تھی اور میں رہ رہ کر اس کا پیار کر رہا تھا میں نے اس سے کہا: "دیکھو سلطانہ تم نے اپنے ساتھ آخر مجھ کو بھی رسوا تو کیا ہی لیکن کم سے کم ابھی اس راز کو علانیہ افشا تو نہ کرو۔ تمہارے ماں باپ کیا کہیں گے؟ دنیا اس کو کیا سمجھتی ہوگی؟ ابھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے ساتھ شادی

کروں۔ میری عمر ابھی مشکل سے ۱۸ برس کی ہے۔ تمھاری عمر بھی کم و بیش یہی ہوگی۔ اس عمر میں اپنی مرضی سے شادی کر لینا بیشمار جھگڑوں کو مول لینا ہے پھر کیا وجہ کہ ہم لوگ وقت کا صبر اور سلیقہ کے ساتھ اِنتظار نہ کریں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے کو جس طرح چاہتے رہے ہیں چاہتے رہیں اس میں کسی کا کیا اِجارہ ہے؟ مگر زمانہ کی رسم سے علی الاعلان اِنحراف کرنا مناسب نہیں۔

سلطانہ نے اپنے کو میری آغوش میں حوالہ کر کے اور اپنی مدہوش آنکھوں کو میری آنکھوں میں ڈالکر کہا:۔

طاعت پیر مغاں کن وز ہمہ بیگانہ باش
اول از میخانہ بودی آخر از میخانہ باش

اِس کے بعد کہنے لگی "میں چاہتی ہوں کہ دنیا اس بات کو جان لے اور اس سے مانوس ہو جائے کہ میں تم کو چاہتی ہوں۔ پوجتی ہوں۔ تم پر جان نچھاور کرتی ہوں۔ ہاں اِس خیال سے البتہ دم گھٹ رہا ہے کہ ابھی تم میرے ساتھ شادی نہیں کر سکتے ہیں صبر کے ساتھ تمھارے لیے اِنتظار تو قیامت تک کر سکتی ہوں مگر کیا کروں تمھاری طرف سے مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں میرے بس سے نکل نہ جاؤ۔ تم تو اڑتی ہوئی پنچھی ہو۔ ہاتھ لگے تو

لگ گئے نہیں تو پھر نہ جانے تم کہاں اور میں کہاں ؟ اس کا اطمینان دلاؤ کہ تم میرے سوا کسی کے نہیں ہو گے تو اطمینان اور سکون کے ساتھ انتظار کی گھڑیاں گنوں۔"

میں نے اس کا منھ چوم کر کہا " سلطانہ میں آخر تم کو کیسے اطمینان دلاؤں سوا زبان سے کہنے کے اس وقت اور کیا کر سکتا ہوں۔ اب اگر تم نہیں تو میری دنیا ہمیشہ خالی رہے گی میرا خود دم گھٹ رہا ہے کہ کسی طرح جلد وہ وقت آ جائے تم کو کوئی مجھ سے چھین نہ سکے لیکن

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

سلطانہ تڑپ گئی اور کہنے لگی :۔

تم بڑے ظالم ہو۔ اس وقت یہ کہکر تم نے میرے اندر میری اپنی محرومی اور بیچارگی کا احساس کس قدر تیز کر دیا ہے۔ آہ !

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خوں جگر ہونے تک

یہ کہکر سلطانہ نے مجھکو بھینچ کر پیار کیا۔ اس کی آنکھیں محبت کی شراب سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

ایسے راز و نیاز کے موقع ہم کو روز نہیں ملتے تھے۔ سلطانہ کی طرف سے تو کبھی پس و پیش نہیں ہوتا تھا۔ میں ہی پہلو بچاتا رہتا تھا۔ حالانکہ سلطانہ کا سودا میرے سر میں بھی اچھی طرح سا چکا تھا جو اب نکالے نکل نہیں سکتا تھا۔ آج عرصہ کے بعد بوس و کنار کی نوبت آئی تھی۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو کر اس کی لذتوں میں کھو گیا۔ اور کھویا رہتا اگر سلطانہ مجھے یہ کہکر چونکا نہ دیتی "تم بھول گئے اور میں بھی بھول چلی تھی کہ آج ۸ بجے جمیل کے وہاں ہم لوگوں کو پہنچنا ہے"۔

اب مجھے یاد آیا کہ جمیل نے جو بی۔ اے کے پہلے سال میں پڑھتا تھا اور جو ہم لوگوں سے مخلصانہ مراسم رکھتا تھا آج شام کو اپنے گھر پر ایک قسم کی ادبی صحبت کا اہتمام کیا تھا جس میں دو ایک بے تکلف پروفیسروں کو اور چند صحیح مذاق رکھنے والوں کو بلایا تھا۔ چونکہ وہ رتن کا ہم جماعت تھا اس لیے مجھ سے بھی اچھی طرح واقف تھا اور میرے ادبی ہذیانات کا قائل تھا۔ میں بھی اس کے وہاں مدعو تھا۔ اور سلطانہ بھی سلطانہ اپنے ادبی انہماک اور اپنی دلکش شخصیت کی وجہ سے سارے شہر میں ایک خاص مرتبہ رکھتی تھی اور شاید ہی کوئی صحبت یا کوئی انجمن ایسی ہو جس میں وہ نہ بلائی جاتی ہو۔ میں خسرو باغ سے اٹھا اور چلتے چلتے سلطانہ سے کہا "خدا کے لیے مجھے جمیل کے وہاں رسوا نہ کرنا تم سے میں

ڈرنے لگا ہوں۔" سلطانہ نے ہنسکر کہا۔" انشاء اللہ نہیں۔"

جمیل کے وہاں اچھا خاصا مجمع تھا۔ رتن مع لیلا کے پہلے سے موجود تھا۔ پروفیسروں میں صرف دو پروفیسر آئے تھے۔ ایک تو ہمارے فلسفہ کے پروفیسر مسٹر گھوش دوسرے تواریخ کے خطیب احمد مرزا جو بزعم خود ادبیات میں بھی دخل رکھتے تھے۔ لیکن حقیقتاً ان کو ادبیات کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ بیچارے جا بیجا ہر جگہ اپنی تنقیدی رائے دیکر اپنی ادب نوازی کا ثبوت دینا چاہتے تھے مگر کامیاب کبھی نہیں ہوتے تھے۔ آج بھی انھوں نے خواہ مخواہ کی بحث چھیڑ دی اور مشرقی اور مغربی شاعری کا موازنہ کرنے لگے۔ مشرقی شاعری سے ان کو شکایت یہ تھی کہ وہ غیر قدرتی ہوتی ہے اور سوا مبالغہ اور تشبیہ و استعارہ کی بھرمار کے اس میں کچھ ہوتا نہیں۔ میں تو ان کا منہ تکنے لگا۔ جب میں نے ان کی زبان سے یہ سنا کہ "مشرقی شاعری میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ شروع سے لیکر آخر تک ایک مجہولیت یا انفعالیت ہوتی ہے برخلاف اس کے مغربی شاعری قدرتی ہوتی ہے اور اس کے اندر طبیعت میں ابھار پیدا کرنیوالی ایک قوت ہوتی ہے۔" اُن کا روئے سخن خصوصیت کے ساتھ اردو فارسی شاعری کی طرف تھا۔

رتن نے کہا۔" پروفیسر صاحب گستاخی معاف، میرا خیال ہے کہ

جس چیز کو آپ مجہولیت یا انفعالیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل قوت کی انتہائی سنجیدگی، سکون، انضباط اور توازن کا نام ہے۔ مشرقی شاعری کے اندر جو قوت ہوتی ہے اس کا مظہر ہیجان و انتشار نہیں ہے بلکہ سکون و اطمینان ہے وہ اعصاب اور گوشت و پوست کی حرکت میں نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں لطیف ارتعاشات کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ ہاں میری مراد اس شاعری سے بھی ہے جس کو جذبات سفلی کی شاعری کہتے ہیں۔ ہاں اس کے اثرات بھی وجدان روح و قلب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی شاعری کے اندر جس قوت سے آپ اس قدر متاثر معلوم ہوتے ہیں وہ ایک ظاہری قوت ہے جس کے حرکات کا تعلق بیشتر ہمارے حواس ظاہری سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس وقت کے اثرات کو بہت جلد نمایاں طور سے محسوس کر لیتے ہیں۔ لیکن مشرقی شاعری کی قوت سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کو محسوس کرنے کے لیے بہت لطیف اور غائر حس کی ضرورت ہے ایک ظاہری قوت ہے دوسری باطنی۔"

پروفیسر صاحب کچھ جواب دینا چاہتے تھے کہ میں نے کہا: "اور جس چیز کو آپ مبالغہ، استعارہ اور تشبیہ کے نام سے بدنام کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل تخیل کی انتہائی وسعت ہے شاعر کا تخیل محیط اور ہمہ گیر ہوتا ہے

وہ ایک چیز کو جس سطح سے دیکھتا ہے اور جس حد تک دیکھتا ہے وہ کچھ اسکی
الہامی بصیرت ہی کا حصہ ہے وہ ان امکانات کا رازدار ہوتا ہے جو واقعات
کے اندر چھپے ہوئے اور دبے ہوئے پڑے ہیں اور جو بہت ممکن ہے
کبھی وقوع پذیر نہوں۔ پھر چونکہ اس کے لیے زمان و مکان کے حائلات
و مزاحم کوئی معنی نہیں رکھتے اس لیے وہ آزادی کے ساتھ ان امکانات
کو صورت دیکر کم سے کم ہماری نظر تک پہونچا دیتا ہے جو کسی دوسرے
طریقہ سے شاید کبھی ہماری نظر کے سامنے نہیں آسکتے۔ یہ تو ہوا مبالغہ کا
راز، رہ گیا تشبیہ و استعارہ سو ان نکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے
کہ آپ کو مابعد الطبیعات کے نکات میں بھی دخل ہو۔ اس سے کسی
صاحب فکر کو انکار نہیں کہ کائنات میں جتنے تنوعات پائے جاتے
ہیں ان سب کی اصل و ماہیت ایک ہے۔ اب اگر تمام اشیاء کی اصل
و نسل ایک ہے تو کائنات کے تمام تنوعات و صوریں کچھ نہ کچھ مشترک
عناصر ضرور رہوں گے یہ اور بات ہے کہ ہم ان کو محسوس نہ کرسکیں اسلیے
کہ ہمارے حواس سطحیات تک محدود ہیں۔ شاعر، صوفی، فلسفی کی نگاہ ہماری نگاہ
کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اس اشتراک و تجانس کو دیکھتے اور
محسوس کرتے ہیں جو سائر کائنات کی روح رواں ہے۔ شاعر کو فلسفی پر
جو فوقیت ہے وہ یہ ہے کہ فلسفی جو کچھ دیکھتا ہے اس کو محض نظری طور پر

بیان کر کے رہ جاتا ہے۔ شاعر اس کو محسوس صورت میں پیش کرتا ہے اور صوفی پر شاعر کو جو فوقیت ہے وہ یہ ہے کہ صوفی اپنے محسوسات و مدرکات کو اپنی نجی کی ملکیت سمجھ کر چپ رہ جاتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا کہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اس کو لب پر بھی لے آئے۔ شاعر یہاں صوفی سے منزلوں آگے ہے۔ وہ جن اسرار سربستہ سے خود آگاہ ہوتا ہے اس سے خلق اللہ کو بھی آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ہاں تو تشبیہ و استعارہ کی اصل یہی وحدانیت ہے۔ تشبیہ اور استعارہ میں محض تخیل کے مدارج رسائی کا فرق ہے۔ اور پروفیسر صاحب یہ آپ کا کیا خیال ہے؟ مغربی شاعری کے جو بہترین نمونے ہیں وہ صرف تشبیہ و استعارہ کے نمونے ہیں۔ آپ ذرا ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس، بائرن، براؤننگ، ٹینی سن، سوئنبرن وغیرہ کے اختراعات فائقہ کو اس نظر سے دیکھ ڈالیئے ...."

اس کے بعد میں نے انگریزی، اردو، فارسی اور کچھ ہندی شاعری سے مثالیں پیش کیں:-

رتن، لیلا اور سلطانہ اور خود پروفیسر صاحب دم بخود سنتے رہے۔ جب میں کہہ چکا تو سب پروفیسر صاحب کی طرف مخاطب ہوئے کہ دیکھیں اب وہ کیا جواب دیتے ہیں مگر پروفیسر صاحب سے پھر کچھ نہ

کہا گیا۔ اور وہ غالباً مجھ سے اور رتن سے کبیدہ ہو گئے۔

جب سب لوگ رخصت ہونے لگے تو سلطانہ نے موقع پاکر مجھ سے آہستہ سے کہا۔

" میں ابھی تھوڑی دیر اور تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تم انکار تو کر نہیں سکتے لیکن یہ بتاؤ اطمینان سے باتیں کرنے کے لیے جگہ کونسی بہتر ہوگی ؟ کیوں نہ ہم لوگ جمنا کے پل کی طرف چلیں ؟"

میں کوئی عذر نہیں کر سکا اور نہ کوئی عذر کرنا چاہتا تھا چپکے سے ساتھ ہو لیا۔ چلتے ہوئے رتن نے میرے کان میں کہا۔

اب تو میرے لیے تم عید کا چاند ہو رہے ہو۔ خیر۔ لیکن ذرا اپنے کو لیے دیئے رہا کرو۔ تاکہ رسم محبت کی تازگی اور کیفیت میں کمی نہ ہو۔"

میں جھیپ کر رہ گیا اور کوئی چست اور برجستہ جواب نہ دے سکا۔

چاندنی رات میں جمنا کی سیر فردوس کی سیر سے کسی طرح کم نہیں ہم لوگ پل سے نیچے اتر کر دریا کے کنارے ایک صاف ستھری جگہ بیٹھ گئے۔ چاند اپنی پوری صباحت کے ساتھ نکلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی دریا سے نہا کر نکلا ہے۔ سلطانہ نے پوچھا "کیوں اس وقت چاند کی دیوی کو دیا نہ سمجھا جائے یا لونا ؟"

میں نے کہا " اس وقت تو میں اس کو صید افگن دیانہ ہی سمجھونگا

خاص کر جب کہ دیا نہ کی ایک مورت میرے پہلو میں موجود ہے۔ خدا نہ کرے ایسے موقع پر لونا کا سامنا ہو۔ لونا تو لوگوں کو پاگل اور مفلوج کر کے چھوڑتی ہے۔" آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دراصل مجھکو لونا ہی سے سابقہ ہوا تھا۔

اس کے بعد سلطانہ نے کہا "آج جب تم لوگ نظریۂ شاعری سے بحث کر رہے تھے تو مجھے خسرو کا ایک شعر بے طرح یاد آرہا تھا۔

جان ز نظارہ خراب و ناز او ز اندازہ بیش

ما بہوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

تخیل کے مبالغہ اور تصور کے ارتقا کی کتنی مکمل مثال ہے لیکن مجھے شعر ایک اور سبب سے بھی یاد آرہا تھا آخر تم مجھے کہاں تک اس "پیمانہ" سے چھکاتے چلے جاؤ گے؟۔

میں اب اپنے کو روز بروز نہیں ساعت بہ ساعت بیتاب و مضطر پا رہی ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم جلد سے جلد ایک دوسرے کے رفیق حیات بن جائیں؟" سلطانہ پر آج جو پرخروش حالت طاری تھی وہ غیر معمولی تھی۔ میرے قلب کی حرکت بھی خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔

لیکن اس پر بھی میں نے ضبط سے کام لیا اِس لیے کہ میں سلطانہ سے اس کی کمزوری کی ساعتوں میں بہت سنجیدگی، وقار اور ضبط کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ یہ کہنے کو نہ ہو کہ جذبات کے ہیجان میں اندھے ہو کر ہم نے کچھ کر ڈالا اسی لیے میں نے کہا۔

"سلطانہ خیر اب تو ہماری محبت پردہ کی چیز رہی نہیں۔ گلی کوچہ میں اس کا چرچا ہے۔ یار واغیار اس کو جان گئے ہیں۔ نذیر بھائی نے اسی غم میں الہ آباد یونیورسٹی کو خیر باد کہدیا اور بمبئی میں جاکر منھ چھپا لیا۔ میں تو اب عمر بھر ان کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ مگر میں آخر وقت تک تمھارے ذہن نشین کرتا رہوں گا کہ میں ایک ناکارہ مجہول الوجود، ضعیف القویٰ، اور نحیف الجثہ شخص ہوں اور میرے ساتھ اگر کسی کو ایسا عاشقانہ شغف ہو تو حیرت کی بات ہے۔ میری زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ دل خراب ہے۔ شاعروں کی طرح نہیں بلکہ مریضوں کی طرح۔ ایسا نہ ہو کبھی میری پابند ہو کر پچھتاؤ پھر میری زندگی جیتے جی موت ہوگی۔

سلطانہ نے پیار سے کہا" میں کتنی بار کہوں کہ میں نے سب کچھ جان بوجھکر اپنے کو تمھارے حوالہ کیا ہے۔ ہاں میں تمھارے خراب دل کی پجاری ہوں اور رہوں گی۔ محبت دو جسموں کا نہیں دو روحوں کا پیمان رفاقت ہے۔" یہ کہکر اس نے اس طرح میرا پیار کیا کہ میرے سارے جسم میں

ایک لہر دوڑ گئی اور میں نے بھی جی کھولکر اس کا پیار کیا۔ اس دوران میں میں سلطانہ کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ جذبات سے سرشار ہوجانیوالی عورت تھی۔

جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو سلطانہ نے پھر کہا۔

"خدا کے لیے مجھے اپنی بنالو اور جلد بنالو۔ میرے ذوق کی تشنگی کو جو میری ساری فطرت کی تشنگی ہے جلد سیراب کرو۔ اب مجھ میں "بیداد انتظار" کی زیادہ طاقت نہیں ہے۔"

مجھے ایسی باتیں سنکر اپنی قسمت پر ناز ہونے لگتا تھا۔ آج بھی میں اس پندار میں مست تھا کہ سلطانہ جیسی عورت مجھے چاہتی ہے اور میری رفاقت کی ہوس رکھتی ہے۔ آج کی سرمستی نے مجھے دنیا و مافیہا سے ایسا بیخبر کر دیا تھا کہ مجھ سے بھی رہا نہ گیا اور میں نے سلطانہ کو اپنی تنگ آغوش میں کھینچکر کہا "اچھا سلطانہ اب تو ہرچہ بادا باد کہہ چکا۔ اس کا انجام جو کچھ ہو۔ لیکن آج اس کو میرا ناقابل شکست عہد سمجھو۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا منھ چوم لیا۔ سلطانہ جامہ میں پھولی نہ سمائی اور اپنی سرشار آنکھوں سے ایک بار مجھکو دیکھکر جواب میں میرے ہونٹوں پر بوسوں کی بوچھار کرنے لگی۔ وہاں سے جب ہم اٹھکر گھر جانے لگے تو سلطانہ ایک سرد آہ کرکے بولی "کاش اس گھڑی کے بعد اب ہم کو انتظار کی گھڑیاں گننا نہ پڑیں۔"

آج کے لیے اِتنا بہت ہے۔ اَب "کارامروز" کو " فردا" پر اٹھا رکھتا ہوں۔

یکم مارچ۔

بسنت رُت شروع ہوگئی ہر چیز میں نمو کا عالم ہے ہر طرف رنگ و بو کی ابتدا ہے فضا مخمور ہو رہی ہے۔ ہوا زور بھر رہی ہے۔کائنات کے لیے زندگی اور نشاط کا دور آ رہا ہے مگر میری زندگی کی بساط اُلٹنے والی ہے۔ سبک رفتار پیک اجل ہر لحہ قریب آتا جاتا ہے۔ اب اس کو جمعہ جمعہ کے دن باقی ہیں جبکہ میں اپنا سارا ساز و برگ حیات اس کے حوالہ کر دوں اور میرے مرنے کے بعد دنیا کے لیے "کل دوسرا دن ہو؟"

میں اپنے اندر بہار کا کوئی دلولہ نہیں پاتا۔ کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ اسی موسم انبساط کے آتے ہی میں پپیہے کی تڑپ اپنے اندر پلنے لگتا تھا۔ میری طبیعت میں ایک گدا ختگی آجاتی تھی اور اسی پپیہے کی ہمنوائی میں فضا کو اپنے ترانوں سے معمور کر دیتا تھا۔ میرے بہترین اشعار اور بہترین نظمیں اسی موسم رنگ و بو کی یادگاریں ہیں۔ میں نے بہترین مضامین اسی زمانے میں لکھے ہیں۔ میں نے اپنی سرگزشت میں اپنی زندگی کے

اَدبی رُخ کو شرح و تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا اِس لیے کہ اَب میرے لیے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں ورنہ کسی زمانہ میں اپنی جداگانہ ادبی شخصیت رکھتا تھا۔ اور ادیب و شاعر سمجھا جاتا تھا۔

ہاں تو اَب میرے لیے بہار کی رنگینیوں اور نکہت بیزیوں میں کوئی لذّت نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خود دل میں مزہ نہیں ہے جس کی بدولت ہر چیز میں لذت ہوتی ہے میں سمجھ رہا ہوں کہ اس وقت ہر شخص کے دل میں کیسا اُبھار پیدا ہو رہا ہوگا۔ ہر کوئی اپنے رگ وپے میں زندگی اور تازگی کی کیسی لہر محسوس کر رہا ہوگا۔ شام کا وقت ہے۔ ہوا میں شباب و شراب کی سی کیفیت ہے۔ مگر یہ کیفیت کسی طرح دل کے اندر نہیں سماتی۔ ساری دنیا کی بہار شگفتہ ہے۔ رنگین ہے۔ خوش آہنگ ہے مگر میری بہار یکسر پژمردگی اور بے رنگی ہے، میں بہار کو کیا سمجھوں اور اس کی خوشی کیا مناؤں اور اس کے ترانے کیا گاؤں!

بہارِ گل کی خوبی ہم دل افگاروں سے مت پوچھو
مزا گلگشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو

دیکھا آپنے؟ بہکنا اس کو کہتے ہیں۔ میں اپنی داستان کو ختم کرنے بیٹھا تھا اور لگا شاعری کرنے جس سے اب مجھکو کوئی موانست باقی

نہیں رہی۔ اس پر بھی اتنی شاعری کر گیا۔ خیر اب سنئے۔

میری داستان ابھی تک میرے لیے کسی قدر رمزیدار تھی اس لیے میں نے اس کو کچھ طوالت کے ساتھ بیان کیا لیکن اب مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ شرح و تفصیل کے ساتھ اس داستان کے باقی ٹکڑوں کو آپ کے سامنے لاؤں میں اب اختصار سے کام لینا چاہتا ہوں۔ اور آپ لوگ اکتانے بھی لگے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ:۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

اس لیے اب صرف واقعات سن لیجئے۔

جس سال میں نے بی، اے پاس کیا اور ایم، اے میں داخلہ کرایا اس سال میری ماں کو سخت اصرار ہوا کہ میں شادی کر لوں اور اسی جگہ کروں اب میں نے اپنے کو مجبور پایا کہ ماں سے حقیقت حال بیان کر دوں میری ماں کو اس انکشاف سے ایسا دھکا لگا کہ وہ بیمار سی ہو گئی۔ لیکن میں اپنے خیال میں ایسا محو اور برخود غلط تھا کہ ماں کے صدمہ کی کوئی پروا نہ کی یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ میں دسہرہ کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے فوراً سلطانہ کو لکھدیا کہ وہ اب کے شادی کے لیے تیار رہے میں آتے ہی اس کے ساتھ شادی کر لونگا۔

سلطانہ کی منہ مانگی مراد ملی۔ اس نے تھوڑی بہت زحمت اور

وقت کے بعد اپنے والدین کو بھی اس پر راضی کرلیا۔ اور اس کے والدین کو دراصل مجھ سے کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا تھا اس لیے کہ میں دولت و ثروت والا تھا مگر میری ماں کو اس رشتہ پر نہ راضی ہونا تھا نہ ہوئی۔ اس کو میری طرف سے سخت مایوسی ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بیمار رہنے لگی اور آخرکار اسی کلفت میں اس کا کام تمام ہوگیا۔

میں نے آخرکار سلطانہ سے شادی کرلی اور اس کے چار مہینہ بعد میری ماں کا انتقال ہوگیا۔ میرے ہاتھ (میرے خیال میں) ایسی دولت لگ گئی تھی کہ مجھے ماں جیسی دولت کے ضایع ہوجانے کا اتنا غم نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا۔

اب میں تھا اور سلطانہ تھی۔ باقی ساری دنیا ہمارے لیے حرف غلط ہوکر رہ گئی تھی۔ سلطانہ واقعی میری محبت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کو میری اتنی دھن تھی کہ وہ میرا کالج جانا مشکل سے گوارا کرسکتی تھی اس کو اتنی جدائی بھی شاق گزرتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ میرے زوال وادبار کو بھی شروع ہونا تھا۔ اب تک تین برس کے اندر مجھ پر صرف دو تین بار وجع الفواد کے دورے پڑے تھے اور نہ میں نے ان کو کوئی اہمیت دی تھی نہ سلطانہ نے اور نہ میرے ڈاکٹروں نے لیکن اب مجھ پر جلد جلد دورے پڑنے لگے۔ ڈاکٹروں کو تشویش شروع ہوئی۔ سلطانہ متفکر رہنے لگی

اور میں اندیشہ ناک۔ مجھے سلطانہ سے ندامت تھی۔

شادی کے بعد مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سلطانہ کس مزاج و طبیعت کی عورت ہے۔ سب سے پہلے مجھ پر جو حقیقت منکشف ہوئی وہ یہ تھی کہ سلطانہ کی طبیعت میں رشک و حسد کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے، وہ کبھی اتنا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میں کسی دوسری عورت سے گھل مل کر باتیں کروں اور اس کا موقع مجھے آئے دن ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اسکول اور کالج کی لڑکیوں سے مجھے روز ہی سابقہ پڑا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں سلطانہ کی فطرت سے آگاہ ہو گیا اور اس کا لحاظ کرنے لگا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی طبیعت کا ایک اور رخ روشن ہوا۔ یہ وہی رخ تھا جس پر اب تک شاعری اور ادبیات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی پر صرف اس وقت تک دم دے سکتی ہیں۔ جب تک کہ اس کے اندر دلفریبیاں موجود ہیں جن کی "عشق کی گرمیاں" محتاج ہوتی ہیں یا "حسن کی شوخیوں" کی سلطانہ کی فطرت کا یہ انکشاف میرے لیے پیام موت سے کم نہ تھا۔

میں نے بڑے بھلے ایم' اے کر لیا۔ لیکن اس سے آگے کچھ کر نہ سکا۔ مجھے ارمان تھا کہ ایم' اے۔ کے بعد ایسی یونیورسٹی میں پروفیسر رہوں۔ مگر گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے میرے دل کی بیماری نے میری

صحت کو ایسا غارت کر رکھا تھا کہ اب میرے لیے دنیا کا کوئی کام کرنا ممکن نہیں تھا ڈاکٹروں نے بالاتفاق کہدیا کہ اگر آپ ساری دنیا کے جھگڑوں سے برطرف ہوکر آرام نہیں کرتے تو عجب نہیں کہ آپ کی یہ بیماری بہت جلد آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے۔ میں بھی کچھ سرد دل ہونے لگا تھا۔ میری امنگیں خود بخود دسٹی جا رہی تھیں۔ میں نے بھی سوچا کہ جب میں اپنے حوصلے پورے نہیں کر سکتا تو کیا وجہ کہ اپنے گاؤں میں پا بدامن ہوکر بیٹھ نہ جاؤں۔ آرام کی صورت اس سے بہتر کیا ہوسکتی ہے؟ اور پھر اس طرح میری جائداد ان تمام بدانتظامیوں سے ایک حد تک محفوظ رہے گی جو میرے نہونے سے واقع ہو رہی تھیں ڈاکٹروں کی پہلے تو یہ رائے تھی کہ میں کہیں ساحلی مقام پر جاکر رہوں۔ لیکن جب میں نے اصرار کے ساتھ ان کو اپنی مصلحتیں سمجھائیں تو انھوں نے مجھے اجازت دیدی کہ میں جہاں چاہوں رہوں لیکن آرام اور سکون کو ہر جگہ اور ہر حال میں مقدم سمجھوں۔

سلطانہ کسی طرح میری رائے سے متفق نہیں ہوتی تھی اس نے افسردگی کے ساتھ اور پھر بعد کو دبی ہوئی جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا " آخر تم کو ایک دورافتادہ کوردہ میں جاکر رہنے پر اس قدر کیوں اصرار ہے۔ جبکہ تمھاری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی اگر تم کسی اور بہتر جگہ جانا نہیں چاہتے، تو پھر الہ آباد ہی میں رہو یہاں اگر خدانخواستہ ضرورت ہو تو وقت پہ بہترین

ملتی امداد پہونچ سکتی ہے۔ تمہارے لکشمی پور میں اگر کوئی ناگہانی وقت آپڑا تو کیا ہوگا؟ میرے تو اس خیال سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

میں بھی کچھ جھلایا ہوا تھا اور عرصہ سے اپنی جھلاہٹ کو دبائے ہوئے تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سلطانہ میری طرف سے دلگیر رہنے لگی ہے۔ وہ کئی بار اپنے مقدر کو کوس چکی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ اس کو اپنے مقدر کو کوسنے کا حق تھا۔ مگر مجھے اس سے صدمہ ہوتا تھا اور میرا صدمہ بھی حق بجانب تھا۔ میں اس زعم میں تھا کہ سلطانہ کو میرے ساتھ جو عشق ہے وہ غیر فانی ہے اور مرتے دم تک باقی رہے گا اور ایک رنگ پر قائم رہے گا۔ اور پھر میں پہلے ہی ایک سے زائد مرتبہ سلطانہ کو اس عشق کا نشیب و فراز اور اس کے تمام امکانات سمجھا چکا تھا۔ وہ جانتی تھی اور میں اس کے ذہن نشین کر چکا تھا کہ میرا دل بیمار ہے اور ممکن ہے کبھی یہ بیماری زور پکڑ جائے۔ پھر نہ میری صورت میں وہ آب و تاب رہے گی نہ میری طبیعت میں وہ شعریت رہے گی جو اس وقت اس کو اس طرح گرویدہ کئے ہوئے ہیں۔ سلطانہ نے ان تمام امکانات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں میری موجودہ دلفریبیوں نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے جو بدنصیبی سے ڈیڑھ دو سال کے اندر ہی ہٹ گئے اور بری طرح ہٹ گئے۔ اور اب سلطانہ نے دیکھا کہ وہ کس" بلائے آسمانی کو

اپنا "معشوق" سمجھکر پوج رہی تھی۔ اور وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کو نہ کسی کی طرف مائل ہوتے دیر لگتی نہ کسی کی طرف سے اپنی طبیعت کو پھیر لیتے کوئی قباحت محسوس ہوتی نذیر بھائی کی مثال میرے سامنے تھی۔ افسوس ہے مجھے اس کا احساس بہت دیر میں ہوا۔

جب سلطانہ نے بہت اصرار کے ساتھ مجھے لکشمی پور میں جاکر بیٹھ جانے سے باز رکھنا چاہا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا۔

سلطانہ اگر تم کو میرے ساتھ ایسے کورودہ میں رہنا گوارا نہیں ہے تو میں تم کو اسی جگہ چھوڑ سکتا ہوں اور مناسب بھی یہی ہے کہ تم یہیں رہو۔ تمھارے لیے وہ جگہ موزوں نہیں مگر میں تو ارادہ کر چکا ہوں کہ وہیں رہوں گا اور میں اپنے ارادہ کو فسخ نہیں کرتا۔ میری آواز میں تلخ سے تلخ طنز تھا جس کی سلطانہ متحمل نہ ہو سکی۔

"خیر وہ میرے رہنے کی جگہ ہو یا نہ ہو اب تو مجھے وہاں رہنا ہے اس لئے کہ وہ میری قسمت میں لکھ گئی ہے اگر تم اسی پر تلے ہوئے ہو کہ وہاں چلکر اپنی اور میری جان ضیق میں ڈالدو تو میں بھی راضی ہوں سوا اس کے چارہ ہی کیا ہے؟" سلطانہ اتنا کہکر زار زار رونے لگی۔ مگر اس کے رونے پر مجھے ترس نہیں آیا اس لیے کہ وہ دردمندی اور سوز و گداز کا رونا نہیں تھا بلکہ انتہائی غصہ اور تند مزاجی کا رونا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ

وہ لکشمی پور اس حالت میں میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اس کو رونا اس لیے آیا کہ وہ خوب سمجھ رہی کہ اگر میں اڑ گیا تو اس کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس نے اپنے لب و لہجہ اور اپنے تیور سے اس کو ظاہر بھی کر دیا تھا۔ میں نے آخر کار کہا۔

"سلطانہ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سیدھے سیدھے مان لو کہ مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہو۔ تم جو خواب دیکھ رہی تھیں اسکی تعبیر الٹی نکلی۔ تمھارا خیال تھا کہ میں تمھاری زندگی کو یکسر سرور و کیفیت بنا دوں گا اور میں نے بنا یا اس کو یکسر وبال جان۔ تم اس کا جتنا رونا روؤ کم ہے۔ مگر کم از کم میں خطا وار نہیں ہوں۔ میں نے تم کو پہلے متنبہ کر دیا تھا مگر تم پر تو بھوت سوار تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب سے بھی اگر کہو تو میں تم کو آزاد کر دوں۔ تم اب سے بھی اپنی زندگی کو اپنے حوصلوں کے مطابق بنا سکتی ہو۔ ابھی کچھ گیا نہیں ہے۔

آہ مگر کمبخت نے اس وقت بھی مجھکو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی۔ اُس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا" خواہ مخواہ اپنے نقص کو میرا نقص کیوں ثابت کرنا چاہتے ہو؟ میں اپنے کئے پر پچھتا نہیں رہی ہوں۔ تم البتہ مجھ سے عاجز ہو گئے ہو۔ اس کا مجھکو غم ضرور ہے اور میں اس کوفت میں مرجاؤں گی۔"

"مگر میں تو ساری دنیا سے عاجز اور دل تنگ ہو رہا ہوں اس پر بھی اگر تمہاری حالت اپنی جگہ قائم رہتی تو میں تم سے دل تنگ نہ ہوتا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم کڑھ رہی ہو اور غم و غصہ میں اپنے کو ہلاک کر رہی ہو۔ میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ اٹھا نہ رکھتا۔ تم تو وہ ہو جس کے لیئے میں نے اپنی عزیز ماں کی پروانہ کی۔ اور وہ اسی غم میں جان سے گزر گئی۔ میں تم میں اس قدر محو تھا کہ اس کا بھی غم نہیں کیا۔ مگر اب تو بات میرے قابو سے باہر ہے۔ آخر میں اپنی صحت کو کیسے سدھار لوں۔"

سلطانہ نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا "ہاں اب تو ہر الزام میرے ہی سر تھوپا جاتا ہے۔" میں کچھ اور کہتا مگر اتنے میں رتن آ گیا اور میں اس کے ساتھ ٹہلنے چلا گیا۔ رتن کو مجھ سے اب تک وہی خلوص تھا۔ آج اس نے مجھکو اس درجہ ملول و افسردہ دیکھا تو پوچھا۔

"منظہر میں عرصہ سے تم کو دلگیر پاتا ہوں۔ اور آج خصوصیت کے ساتھ۔ اس کا سبب صرف تمہارے دورے ہیں یا اور کچھ؟" آج میرا دل بھرا ہوا تھا میں نے بے کم و کاست اس سے اپنے حالات بیان کر دیئے۔ رتن نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"افسوس وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ تم کو اپنے اندیشوں سے آگاہ کر دوں۔ لیکن میری ہمت نہیں پڑی اس لیئے کہ

تم سلطانہ کے پیچھے ایسے سودائی ہو رہے تھے کہ اگر میں تم کو سمجھاتا تو تم کو اُلٹے مجھ سے رنج ہوتا۔ سلطانہ دراصل اِس قابل عورت ہی نہیں کہ کسی کی بیوی بنے۔ وہ تو بس اِس قابل ہے کہ اس کے ساتھ ایک شاعرانہ قسم کا انس رکھا جائے اور وہ بھی ایک خاص فاصلہ سے۔ سلطانہ کے ساتھ رومانی تعلق رکھنا چاہیئے تھا نہ کہ ازدواجی۔"

رتن کے اِتنا کہنے نے میرے دل کو ایک قسم کی ڈھارس دیدی اور میں نے وہیں فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اگرچہ میں نے اِس فیصلہ کو رتن سے بھی راز رکھا۔

اَب میں تھک گیا۔

---

۳۲ مارچ -

مجھے اَب آٹھ نو دن میں مرنا ہے۔ اِدھر مجھ پر بہت جلد جلد دورے پڑ رہے ہیں اور سخت دورے پڑ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کئی ہفتہ سے میں ایک حرف نہیں لکھ سکا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہے کہ اگر زیادہ آرام کا خیال کیا تو یہ داستان یونہی ادھوری رہ جائے گی۔ اب چاہے ابھی میری جان پر ہی کیوں نہ بن جائے میں بغیر اس بے کیف

و بے مزہ سرگزشت کو ختم کیئے نہیں رہوں گا۔

میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ سلطانہ کو آزاد کر دوں گا. میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ میرے اور سلطانہ دونوں کے حق میں یہی بہتر ہو گا البتہ میری ہمت نہیں پڑتی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ سلطانہ سے طے کیونکر کروں۔ میں اسی حیص بیص میں تھا۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سلطانہ اِس خط آزادی کو اپنے لیئے نجات کی بشارت سمجھے گی لیکن مجھے الجھن اس خیال سے ہو رہی تھی کہ وہ اس کا اِعتراف اپنی زبان سے کبھی نہیں کرے گی۔ اور اس سے مجھے تکلیف ہو گی۔

لیکن ایک دن خود بخود مجھے اس کا موقع مل گیا۔ کاش یہ موقع میری زندگی میں کبھی نہ آتا۔ میرے اندر اس موقع کی تاب کبھی نہیں تھی۔ اور نہ میں اس کا مستحق تھا۔ اس منظر نے بات کی بات میں میرے اعصاب و جوارح کو اس طرح ہلا کر رکھ دیا کہ پھر میں سنبھل نہ سکا اور شاید میری حالت کی اَبتری کا ذمہ دار یہی منظر تھا ورنہ ممکن تھا میں اپنی بیماری سے جانبر ہو جاتا۔

ایک دن گرمیوں کے زمانہ میں میں علی الصباح گھومنے اور دوا ملک

احباب سے ملنے نکل گیا۔ کئی دن ضعف ونقاہت کی وجہ سے گھر پر پڑے پڑے اکتا گیا تھا۔ کوئی دو گھنٹہ کی سیر وتفریح کے بعد لوٹا مردانہ کمرے میں کپڑے اتار رہا تھا کہ بغل کے کمرے سے جو زنانہ کمرہ تھا دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی ایک تو سلطانہ کی آواز تھی مگر دوسری؟ میں کان لگا کر سننے لگا۔

سلطانہ کہہ رہی تھی "ہاں میں نے اپنی کرنی کا پھل پایا۔ میں نے پہلے تمھاری محبت کو ٹھکرایا اور اس کے بعد نذیر صاحب سے منہ پھیر لیا شاید مجھے اسی کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے اب یقین ہے کہ تمھارے ساتھ میں اس سے کہیں زیادہ خوش وخرم رہ سکتی تھی اور نذیر صاحب تو شاید میری زندگی کو فردوس بریں ہی بنا دیتے اب تو وہ مجھکو ایک چڑیل سمجھنے لگے ہوں گے اور اگر نہ بھی سمجھتے ہوں تو اَب بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ میں نے اپنی قسمت آپ منتخب کی۔ اس کو گلے کی زنجیر سمجھکر اَب تو برداشت کرنا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایک روگی کا روگ مول لے رہی ہوں مگر اَب تو زبان سے اُف نہیں کرسکتی۔ خیر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم میری بے اِعتنائیوں اور تغافل شعاریوں کے باوجود مجھکو اسی طرح چاہتے ہو" اِس کے بعد دیر تک دونوں طرف سے خاموشی رہی میں نے دروازہ کے شگاف سے جھانک کر دیکھا تو سلطانہ ایک مرد سے

ہم آغوش تھی اور وہ اس کو چوم رہا تھا۔ میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ سلطانہ کا خالہ زاد بھائی رفیق تھا جو اپنی تمام نالائقیوں کے باوجود صرف اپنے خاندانی رسوخ و اثر کے برتے پر ڈپٹی کلکٹر ہو گیا تھا۔

اس منظر نے مجھے تیورا دیا اور میں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رفیق میرے کمرے میں سے ہو کر باہر جانے لگا اور مجھکو دیکھکر چونک پڑا۔ مگر پھر اپنے کو سنبھال کر مجھے سلام کیا مجھے یاد نہیں کہ میں نے جواب دیا یا نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی اور اسی طرح سر تھامے بیٹھا رہا۔ رفیق چلا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے سر تھامے ہوئے دیکھکر تردد کے لہجہ میں پوچھنے لگی "کیا آج پھر جی سنسنا رہا ہے؟ تم مانتے نہیں آج تم کو ٹہلنے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ ابھی چار پانچ روز ہوئے تم چارپائی سے ہل نہیں سکتے تھے اب بتاؤ اگر پھر دورا پڑ گیا تو کیا ہوگا؟"

میں نے بات کاٹ کر کہا "ہوگا کیا؟ وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہوا ہے اور جس کے لیئے میں تیار رہوں۔"

سلطانہ ایک آہ سرد بھر کر چلی گئی اور میں اپنی آئندہ زندگی پر غور کرنے لگا اللہ اللہ! یہ وہی سلطانہ تھی جس نے میرے پیچھے میرے لیئے ساری دنیا کو تج دیا تھا اور نہ جانے کتنوں کو اپنے سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اور آج

وہی سلطانہ مجھکو اپنے لیے ایک بلا سمجھ رہی تھی اور مجھ سے پناہ مانگ رہی تھی۔ آج مجھکو روشن آرا بے طرح یاد آرہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اب دل میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کون جانے وہ بھی سلطانہ کی طرح میری یہ حالت دیکھکر مجھ سے جی چرانے لگتی۔ شاید فطرت انسانی یہی ہے۔ ایک جوان حسین عورت جس کی فطرت میں شعریت اور رومانیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہو کہاں تک ایک جاں بلب روگی کے ساتھ "پیمان عشق" نباہ سکتی ہے۔ یہ سب میری اپنی بدبختی تھی۔ مگر اس میں میرا کیا قصور تھا جس کی سزا میں مجھ پر یوں "ہفت افلاک کے ظلم" ہو رہے تھے؟ میرا سر چکرا رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ سوا اس کے کہ سلطانہ سے کچھ نہ کہوں اور اس کو الہ آباد میں چھوڑکر خود لکشمی پور جلد سے جلد پہونچ جاؤں۔ اور اب جلد سے جلد کے یہ معنی تھے کہ کل صبح ہی الہ آباد اور سلطانہ کو اپنا آخری سلام کہوں۔ میں چپ چاپ سامان سفر درست کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ میرے کمرے میں پھر آئی اور مجھے اپنی چیزیں سنبھالتے دیکھکر حیرت سے پوچھنے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ میں پھر خاموش رہا۔ اس نے کہا "آخر بولتے کیوں نہیں۔ کہیں دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟"

میں نے مصنوعی اور طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
"اگر خراب ہو نہیں گیا ہے تو اب بہت جلد خراب ہونے والا ہے۔ تم خدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔"
"آخر معاملہ کیا ہے؟" سلطانہ نے کسی قدر تشویش سے پوچھا۔ "تم کو ہو کیا گیا ہے؟"
"کوئی نئی بیماری نہیں" میں نے کہا۔
تم مطمئن رہو۔ میں کل صبح اپنے وطن جا رہا ہوں اور ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔"
"تو پھر میں بھی تیاریاں کروں۔ یا مجھکو ساتھ لے چلنا نہیں چاہتے؟" سلطانہ نے کہا۔
میں نے اپنی نگاہیں اس پر جمادیں۔ اس کی آنکھیں ان مجرموں کی طرح جھک گئیں جو کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔ میں اپنے اندر ایک تازہ قوت محسوس کرنے لگا۔ میں نے بے دریغ ہو کر کہا۔
"سلطانہ آخر کہاں تک مجھکو فریب میں مبتلا رکھو گی۔ کھلم کھلا اعتراف کر لینے میں آخر کیا رکاوٹ ہے۔ تم مجھکو اپنی زندگی کا وبال سمجھ رہی ہو اور ٹھیک سمجھ رہی ہو تم کو اگر مجھ سے کبھی درحقیقت محبت تھی تو اب نہیں رہی۔ تم کو اب صرف لاج ہی لاج ہے ورنہ تم مجھ سے پناہ چاہتی ہو

اور مجھکو اس خیال سے اطمینان ہے کہ تم نے ابھی سے اپنی نئی زندگی کا نقشہ تیار کر لیا ہے۔" تمھارا مطلب کیا ہے؟" سلطانہ نے بغیر نظر اٹھائے ہوئے پوچھا۔

"اس کا مطلب تم کو بہتر سمجھنا چاہیئے۔" میں نے کہا۔

اور اگر میری ہی زبان سے سننا چاہتی ہو تو سنو۔ رفیق ابھی تمھارے ساتھ کیسا اختلاط برت رہے تھے؟ لیکن چلتے چلتے میری یہ رائے سن لو کہ تمھارے لیے نذیر بھائی رفیق سے ہزار درجہ بہتر تھے۔" میرا خیال تھا کہ میری اس فاش گوئی سے سلطانہ پانی پانی ہو جائے گی مگر اس کے تیور سے شرمندگی نہیں بلکہ سراسیمگی ٹپک رہی تھی اور یہ سراسیمگی بھی دیر پا نہیں تھی۔ اس نے اپنے تیور برابر کر لیے اور مجھ سے آنکھیں دوچار کر کے پوچھنے لگی۔" تو اب کیا فیصلہ ہے؟ میں سفر کے لیے تیاری کروں یا نہیں؟"

میں نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔" میرا فیصلہ وہی ہے جو مہینوں سے میں کیے ہوئے ہوں۔ تم مجھکو چھوڑ دو اور میں تم کو۔ تم اپنے نئے رنگ محفل کے لیے سامان کرو۔ میں جا کر اپنے گور و کفن کا انتظار کروں۔ اس سے زیادہ مجھے کہنا نہیں ہے۔"

سلطانہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔ اور پھر اس کے بعد میں نے اسکی صورت

نہیں دیکھی وہ اسی کے دو ایک گھنٹہ کے بعد اپنے میکہ چلی گئی اور پھر مجھ سے نہیں ملی۔ وہ نہ اب میرا سامنا کرسکتی تھی اور نہ اس کو اس کا کچھ ایسا شوق تھا۔ دوسرے دن صبح کو میں ایک ڈوبتا ہوا دل لیکر الہ آباد سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔

میں نے یہاں پہونچکر ٹھنڈے دل سے اپنی اب تک کی زندگی پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے سلطانہ کی بے وفائی کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ میری ساری زندگی ایک مستقل صدمہ ہوکر رہ گئی تھی۔ میں زندگی ہی سے مایوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں کوئی حوصلہ یا ابھار باقی نہیں تھا۔ میں حقیقی معنوں میں بیدل ہو رہا تھا۔ مجھے اس کا احساس بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا کہ کبھی سلطانہ پر میں نے دم دیا ہے یا سلطانہ نے مجھ پر دم دیا ہے۔ بہت جلد سب کچھ ایک بھولا ہوا سا خواب ہوکر رہگیا۔ اور پھر میں سلطانہ کو انصاف کی رو سے بے وفا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی اور بے کیف زندگی نہیں بسر کرسکتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں بدستور تندرست اور صحیح و توانا رہتا اور میرے اندر شعر و محبت کی صلاحیت دھیرے دھیرے فنا نہ ہو جاتی تو سلطانہ مجھے چھوڑکر کبھی کسی دوسرے کی طرف مائل نہوتی۔ اس نے مجھے جس قدر چاہا اور جبتک چاہا سچے دل سے چاہا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا

شادی کرنے کے بعد مجھے تم سے کیا مایوسیاں ہوتیں اور اب میرے اندر اس کی تاب نہیں کہ اس قسم کی مایوسیوں کو گوارا کروں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

" جس کی انسان محبت کرتا ہو اس کو کبھی زیادہ قریب سے جاننے پہچاننے کی کوشش نہ کرے "

روشن آرا " قرب محبوب " خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے محبوب کے اندر نہ جانے کتنی خامیاں اور کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں۔

افسوس میں نے اپنے " علم غیب " پر اعتماد نہیں کیا اور اس کی پیش بینیوں کو ہمیشہ توہمات سمجھ کر پس پشت ڈالتا رہا ورنہ روشن آرا، سلطانہ کے ہاتھوں میرا جو حشر ہونے والا تھا اس کو میری " مستقبل بین " نگاہ پہلے سے دیکھ رہی تھی۔ اور مجھے

آگاہ کر رہی تھی بالکل اسی طرح جس طرح اسوقت
وہ میری موت کو دیکھ رہی ہے۔ جب میں
اس کو خاطر میں نہیں لایا تو اس نے بھی جہانتک
میری زندگی کا تعلق سلطانہ سے تھا اپنی
پیش بینی چھوڑ دی۔ روشن آرا یہ سب
میرا مقدر تھا ورنہ اس حالت کو کیوں
پہونچتا۔

دیکھی جو میں نے سرنوشت اپنی
جز روز سیاہ کچھ نہ نکلا

خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب
"روز سیاہ" اور "شب روشن" کا
فرق بہت جلد مٹ جانے والا ہے۔ میں
پہلی اپریل کو دنیا کے تمام جھگڑے چھوڑ کر
ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لوں گا اور پھر
میرے لیئے کچھ نہ ہوگا۔ ڈاکٹر بھی میری
زندگی سے مایوس ہیں مگر وہ یہ نہیں ملتے

کہ میں اتنا جلد مرنے والا ہوں۔ میں جب
ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں تو وہ اس کو میرا
واہمہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ خیر اس کا فیصلہ
آنیوالا وقت کرے گا۔

اَب میری وصیت سُنو۔ تم جانتی
ہو کہ میں صاحب جائداد ہوں اور اچھی جائداد
رکھتا ہوں۔ اس میں سے مشتے از خروارے
بیچ کر میں نے سلطانہ کا مہر ادا کیا ہے۔ اَب
میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ مرنے کے بعد
خواہ مخواہ میری جائداد میرے دور کے
رشتہ داروں میں تکا بوٹی ہو کر بٹ جائیگی
ان رشتہ داروں میں جن کو کبھی مجھ سے
کوئی ہمدردی نہیں رہی اور جن سے مجھے
کبھی کسی قسم کا انس نہیں رہا۔ اِس لیے
میں اپنے مشیر قانونی کو بلا کر اس کو تمھارے
نام ہبہ کر دیتا ہوں۔ تم سے زیادہ میرا
اور میری جائداد کا کوئی اور حقدار نہیں ہو سکتا۔

اَب میری خواہش یہ ہے کہ چاہے تم دوسری
شادی کرو اور چاہے نہ کرو مگر تم یہیں لکشمی پور
میں آکر رہو اور میری جائداد کا خود اِنتظام
کرو۔ اگر تم نے شادی بھی کر لی تو مجھے اُمید
ہے کہ تمھارے شوہر کو اس پر کوئی اِعتراض
نہ ہوگا۔ روشن آرا میری وصیت کو نہ بھولنا
اگر تم یہ خط دیکھتے ہی روانہ ہو جاؤ تو بھی تم
مجھے زندہ نہ دیکھ سکو گی ور اَب مجھے اس کا
موقع نہیں ملے گا۔ کہ تم سے کچھ کہہ سکوں۔
مگر میں یہ تسکین لیئے ہوئے مر رہا ہوں کہ

"بہ جنازہ گرنیائی بہ مزار خواہی آمد"

دیکھو مجھے مایوس نہ کرنا ورنہ میری
روح تڑپتی رہے گی۔ تم کہتی ہوگی کہ یہ بھی کیسی
خواہش ہے۔ مگر اب کیا کروگی۔ ایک
مرنے والے کی یہی خواہش ہے۔ اور وہ بھی
ایسا مرنے والا جس کا زندگی میں کوئی حوصلہ

پورا ہوا۔ اور جو عمر بھر ناکام رہا۔
میری دنیا تو ایسی رہی۔ اَب دیکھو
عاقبت کیسی ہوتی ہے مگر مجھے اس کی
پروا کیوں ہو۔ جیسی دنیا ویسی عقبیٰ۔ اور
اگر عقبیٰ بن بھی جائے تو وہ کس کام کی۔
کم سے کم میری بگڑی ہوئی دنیا کی تلافی نہیں
کرسکتی۔ مگر یہ بحث ابھی سے لاطائل ہے
ابھی تو درمیان میں موت کی منزل باقی
ہے۔ اور

بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا

"تمھارا"

منظہر۔

آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔ موسم میں بھی کل پرسوں
سے نمایاں تبدیلی ہوگئی، اور گرمی اور تپش بڑھ گئی ہے۔ سورج کی کرنیں
معلوم ہوتا ہے ہر چیز کے پُرزے اڑا کر رکھدینگی۔ میری حالت بھی

بہت رری ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے بھی پرزے اڑ رہے ہیں۔ مجھ سے دیر تک بیٹھکر نہیں لکھا گیا اور میں مجبور ہو گیا کہ بستر پہ لیٹے لیٹے لکھوں۔ یہ ہے میری پوری سرگزشت اور یہ ہے میرا آغاز و انجام۔ اب چاہے میرے پڑھنے والے میرے حق میں دعا کریں یا مجھے بُرا کہیں میرے لیئے درحقیقت دونوں یکساں ہیں۔

یکم اپریل

خطرہ اُسیوقت تک خطرہ رہتا ہے جب تک سر پر آنہ موجود ہو۔ میری موت آگئی اور میرے دل سے اس کی دہشت دور ہو گئی۔ میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آواز سُن رہا ہوں۔ میری میعاد زندگی پوری ہو گئی۔ موت کے سامنے میرے سارے دنیوی آلام دور ہو گئے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں پھر سے معصوم و منزہ کیا جا رہا ہوں اور میرے سکون و راحت کی گھڑی آ رہی ہے لیکن پھر یہ رہ رہ کر میرے رونگٹے کیوں تھرا جاتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک گہرے اور تاریک غار کے کنارے لٹک رہا ہوں اور عنقریب میری گرفت

ڈھیلی ہو جانے والی ہے۔ پھر میں ہونگا اور اسی بھیانک غار کی بے پایاں گہرائی۔ میں ہر چیز پر ہوس کی نگاہ ڈال رہا ہوں ہر چیز کی قدر و قیمت میری نگاہ میں دونی ہو رہی ہے میں دیر تک اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ ان کو دیکھ دیکھکر میرا دل امڈا چلا آتا ہے۔ زندگی مجھ سے رخصت ہو رہی اور میں زندگی سے۔ اب تک کئی بار سکرات کا عالم طاری ہو چکا ہے مگر میرا دماغ ابھی پراگندہ اور مختل نہیں ہوا ہے اور میں لکھنے کے قابل ہوں۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو جہاز پر چلا جا رہا ہو اور جس کی آنکھوں سے دھیرے دھیرے ساحل اوجھل ہو رہا ہو۔ کاش میرے حواس بس اس قدر درست رہتے کہ میں ہر چیز کو نظر بھر کر دیکھ سکتا۔

یا اللہ! میں مر رہا ہوں۔ ایک محبت سے معمور دل۔ ایک ایسا دل جو صرف محبت کے لیے پیدا ہوا تھا بہت جلد حرکت کرنا بند کر دے گا اور کیا اب آنے والی دنیا میں بھی یہ دل محبت کے انبساط و آسودگی سے محروم رہے گا جیسا کہ وہ اس دنیا میں محروم رہا۔ افسوس یہ کس قدر ناممکن ہے! میں جانتا ہوں کہ یہ محض ایک خیال محال ہے۔ کاش اس وقت دم نکلنے سے پہلے میں کسی ایسی ہستی کی سوگوار اور دردمند آواز سن لیتا جو میری محبت کرتی ہوتی۔ اس وقت مجھے کیسا اطمینان

ہوتا۔ مگر یہ ناممکن ہے اور میری موت ناکاروں اور ابلہوں کی موت رہی۔ آہ! سے

نگہ کہ بے اثر انفاس سرد ہوتے ہیں
مجھی سے کیا کوئی سب اہل درد ہوتے ہیں

اچھا تو "الوداع۔ اے رونق بزم جہاں"! روشن آرا الوداع! سلطانہ الوداع! میں نے تجھکو معاف کیا۔ روشن آرا میری وصیت یاد رہے۔ مجھے بھولنا نہیں۔ میری روح کو اب صرف تمہارا سہارا ہے۔

بس وہ گھڑی آگئی۔ بہار اور بہار کی رنگینیاں رخصت اُف! کس شدت کی گرمی ہے۔ میرا دم گھٹا جارہا ہے .... شاید میرے پھیپھڑے جواب دے رہے ہیں۔ میری زندگی کا تماشہ ختم ہوگیا۔ پردہ گرایا جارہا ہے۔ ہر چیز پگھل کر مٹی جارہی ہے۔ میں بھی مٹا جارہا ہوں۔ اب میں نکما نہیں رہونگا۔ سورج آج کتنا جمیل نظر آرہا ہے۔ اسکی کرنوں میں خلود و ابدیت کا رنگ ہے۔

اَب مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ میں مر رہا ہوں۔ میرا دم اکھڑ چلا۔ زندہ رہنے والو تم کو زندگی مبارک اور زندگی کی بہار و خزاں مبارک میں چلا ....

ہماری ہردلعزیز مطبوعات

روحِ اقبال۔	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	.	۴	۵
فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	.	۲	۳
فکرِ اقبال	غلام دستگیر رشید	.	۲	۴
آثارِ اقبال	〃 〃 〃	.	۱۲	۳
ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	.	۸	۳
تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	.	۱۲	۳
مقالاتِ محمد علی	حصہ اول و دوم	.	۸	۷
نگارشاتِ محمد علی	مرتبۂ رئیس احمد جعفری	.	۱۲	۳
کاروانِ علم	فیض محمد۔ بادشاہ حسین	.	.	۳
یقین و عمل	عبد القدوس ہاشمی	.	۸	۲
مکالماتِ ابوالکلام آزاد۔	عقیل احمد جعفری	.	۱۲	۳
ریاض خیرآبادی	تسنیم مینائی	.	۸	۳
مردوں کی مسیحائی	عبد الماجد دریابادی	.	۴	۴

کتاب	مصنف	روپیہ	آنہ	پائی
مضامین عبدالماجد دریابادی		۴	۴	۰
ناتسیت	شاہد حسین رزاقی	۲	۱۲	۰
گرداب	احمد ندیم قاسمی	۳	۱۲	۰
سیلاب	" "	۳	۸	۰
انگڑائیاں		۳	۴	۰
زلزلے	قدوس صہبائی	۲	۱۲	۰
کروٹیں	" "	۲	۱۲	۰
زندگی کے نئے زاویئے	رئیس احمد جعفری	۳	۰	۰
زندگی کی ٹھوکریں	" "	۳	۴	۰
وسوسے	فضل حق قریشی	۲	۱۲	۰
صیدِ زبوں	مجنوں گورکھپوری	۲	۰	۰
سَرنوشت	" "	۲	۰	۰
سراب	" "	۳	۸	۰
رنگین سپنے	کوثر چاندپوری	۲	۱۲	۰
نگینے	مظفر حسین شمیم	۲	۱۲	۰
تعبیریں	ایمن شرقپوری	۲	۱۴	۰
دھوپ	قیسی رامپوری	۳	۴	۰

کتاب	مصنف	پائی	آنہ	روپیہ
سنزاء	قیسی رامپوری	۰	۴	۲
ضربیں	״ ״	۰	۰	۳
خطاء	״ ״	۰	۰	۳
غبار	״ ״	۰	۱۲	۲
مسکراہٹیں	کوثر چاندپوری	۰	۱۲	۲
لہریں	شفیق الرحمان	۰	۸	۳
افسانے ڈرامے	منٹو	۰	۱۲	۲
ٹیگور اور ان کی شاعری	مخدوم	۰	۸	۱
رسول پاک کی صاحبزادیاں	قدوسی	۶	۱۲	۰
ہچکیاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۰	۴	۳
اسرار	علی اختر	۰	۱۲	۲
نغمات ماہر	ماہر القادری	۰	۱۲	۳
محسوسات ماہر	״ ״	۰	۱۲	۲
ذکر جمیل	״ ״	۰	۱۲	۱
حج زینت	محسن بن شبیر	۰	۰	۳
تقدیریں	منظور بخاری	۰	۰	۱
پریم پجارن	قدوس صہبائی	۰	۱۵	۰

	پائی	آنہ	روپیہ
ترکستانی خاتون شاہراہ اِنقلاب پر	۰	۹	۰
بخارا کا جمہوری اِنقلاب	۰	۹	۰
یورو پین شعرار اُردو	۰	۱۲	۰
شادی و محبت	۰	۱۲	۰
اِقبال کے خطوط جناح کے نام	۰	۶	۰
اِبن خلدون	۰	۶	۰
ہندوستان کا بڑا شاعر	۰	۸	۱
مجنوں کے خطوط	۰	۸	۲
معاشیات پاکستان	۰	۸	۱
مرد اِنقلاب	۰	۱۲	۰
گاندھی جناح مراسلت	۰	۱۰	۰